

اختر سلطانہ

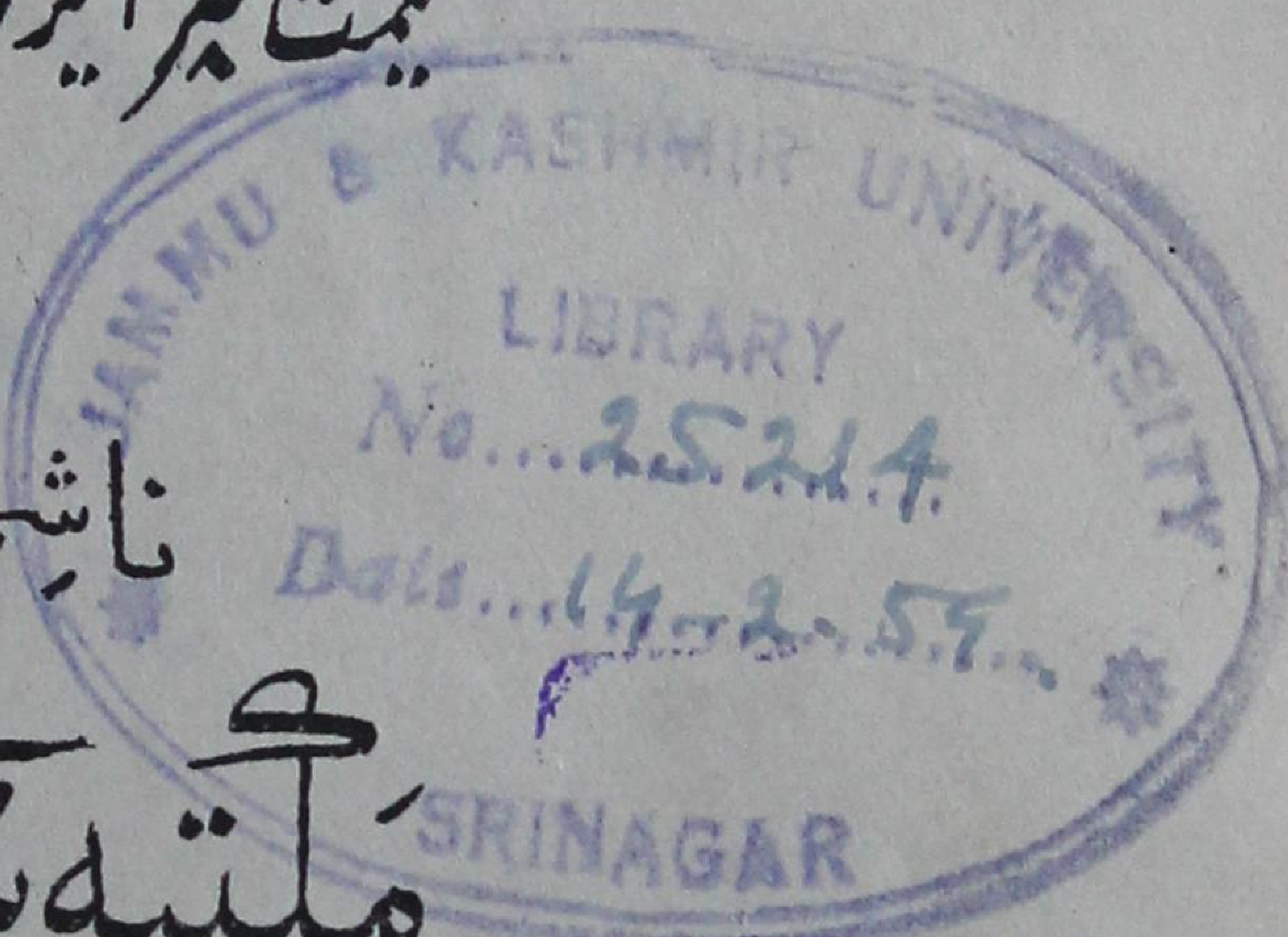
(ناول)

ذوالفقار الحق مہر

مکتبہ سلطانی بمبئی ۳

بار اوّل اگست ۱۹۴۸ء

قیمت عیر ایک روپیہ آٹھ آنہ



ناشر:-

مکتبہ سلطانی

ابراہیم رحمت اللہ روڈ - بمبئی ۳



پرنٹرز و پبلیشرز سلطان حسین اینڈ سنز نے سلطانی فائن آرٹ لیتھو
اینڈ پرنٹنگ پریس بھنڈی بازار بمبئی ۳ سے چھاپ کر وہیں سے
شائع کیا

پیش لفظ

عادل رشید

پیش لفظ:

ہندوستان نے اچھے اچھے ناول نگار پیدا کئے ہیں اور ادب کے اس گوشہ کی چھان بین اگر آپ کریں تو آپ کو علاوہ اور زبانوں کے اردو زبان میں بھی اچھے ناولوں کی معقول تعداد مل سکتی ہے۔

اردو زبان کے ممتاز ناول نگاروں میں مولینا عبدالحلیم شرر کا درجہ کافی اہمیت رکھتا ہے اور مولینا کے بعد اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے اُن کے رنگ کو اپنانے کی جد وجہد کی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی یہ کوششیں ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہیں۔

زیر نظر ناول "اختر سلطانہ" ذوالفقار الحق صاحب قہر کی

ایک اسی قسم کی کوشش ہے۔ موصوف نے اس ناول کے ذریعہ مولینا کے شرر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے وہی انداز اختیار کرنا چاہا ہے جو شرر صاحب کے ناولوں کی خصوصیات تھیں۔

مولینا شرر کے ناولوں کا انداز بیان بڑا گھریلو، بڑا موثر اور بڑا لطیف ہوتا ہے آپ کو کسی جگہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کسی مبلّغ کی تقریر سُن رہے ہیں یا کوئی اُستاد جبراً آپ پر اپنا فلسفہ ٹھونس رہا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام واقعات اپنی جملہ حقیقتوں کے ساتھ آپ کے سامنے سے گزر رہے ہیں اور آپ ان کی طرف سے ایک سکنڈ کے لئے بھی بددِل نہیں ہو سکتے۔

کردار نگاری کا مکمل آرٹ شرر مرحوم کو جیسے قدرت کی طرف سے بطور عطیہ ملا ہو۔ اور وہ اُسے بڑی فیّاضی اور کمال صنّاعی سے استعمال کرنا جانتے تھے۔

"اختر سلطانہ" ناول پر دیباچہ لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں ایک کامیاب ناول کی جملہ خصوصیات کروٹیں بدل رہی تھیں۔ لہٰذا میں نے انھیں خصوصیات کی کسوٹی پر ذوالفقار الحق صاحب قہر کے اس ناول کو پرکھنا شروع کیا۔

اور پورا ناول پڑھ چکنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ قہر صاحب میں ناول نگاری کی تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اگر وہ ذرا اور

احتیاط سے کام لیں اور اپنی جولانیٔ طبع کو سنبھال سنبھال کے کام میں لائیں تو وہ اچھے بہت اچھے ناولسٹ بن سکتے ہیں۔

شرر مرحوم کے آرٹ کا عکس اُن کے اس ناول میں جگہ جگہ موجود ہے وہ اپنی قوت بیان کے ذریعہ لوگوں کو اپنا سکتے ہیں۔ اور اگر وہ ذراسی اور محنت کو جائز سمجھ لیں تو ان کا شمار ہندوستان کے اچھے ناول نگاروں میں آسانی کے ساتھ شامل کر لینے میں بڑے سے بڑے نقاد کو بھی تامل نہ ہوگا۔

ذوالفقار الحق صاحب مہر کے یہاں ابھی کئی چیزوں کی کمی ہے۔ نفسیاتی تجزیہ۔ کریکٹرزئی زیشن اور منظر نگاری۔ پلاٹ کو اتنا الجھانا کہ وہ گتھی کی شکل اختیار کر لے اور یہ یقین کامل ہو جائے کہ اب یہ گرہیں زندگی بھر نہیں کھل سکیں۔ مگر پڑھنے والا نہ اُلجھے بلکہ اس اُلجھاؤ سے اُس کی دلچسپیاں بڑھتی جائیں اور پھر آگے جاکر وہ الجھی ہوئی گتھیاں جو سُلجھ ہی نہ سکتی تھیں اس طرح آپ ہی آپ سُلجھتی جائیں کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھے۔ بڑے کمال کا فن ہے۔ بڑی اہم اور مشکل چیز ہے۔ اور یہ بات آج کے کسی بھی ناول نگار کو حاصل نہیں ہے۔ البتہ مہر صاحب کے یہاں اس آرٹ کی جھلک نمایاں ہے اور ذراسی محنت سے یہ جھلک اور اجاگر ہو سکتی ہے۔

حادثات کی تکرار یکے بعد دیگرے حادثات کا ڈھیر لوگوں کو اکتا دیتا ہے۔ اور پڑھنے والا یہ سمجھنے کے لئے قطعاً حق بجانب ہوتا ہے کہ

محض ناول کے صفحات کے نمبروں کی تعداد کا خیال مصنّف کو حادثات کا
شکار کئے ہوئے ہے، ورنہ ناول کا پلاٹ توکب کا دم توڑ چکا۔

یہ سب سے بڑی کمزوری ہے جو اکثر ناولسٹوں میں پائی جاتی ہے
مگر مہر صاحب نے اس کی طرف سے احتیاط برتنے کی کوشش کی ہے۔
لیکن ابھی اور احتیاط کی ضرورت ہے۔

مجموعی طور پر ناول "اختر سلطانہ" دلچسپ اور مؤثر ناول ہے اور
اسے پڑھ کر آپ اپنی دلچسپیوں کو برقرار رکھ سکیں گے۔ یہ ناول آپ پڑھیے
اور مہر صاحب سے آئندہ اس سے اچھے ناولوں کی توقعات قائم کیجیے۔ وہ
آپ کی حسین توقعات کا خیر مقدم ضرور کریں گے۔

عادل رشید

بمبئی - ۱۵ اگست ۴۹ء

باب ۱

"وہ سوچ میں پڑگیا"

ڈلاو چوک[1] میں تمباکو والے کے یہاں بیٹھا ہوا ایک شریف عورت کو جو کپڑے کی دوکان سے عید کے لئے سرخ جورجٹ کی ساری خرید رہی تھی، سیٹی بجا بجا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی فضول کوشش کر رہا تھا۔

یکایک ایک خوفناک آواز اُس کے کان کے پردے سے ٹکرائی۔ وہ چونک پڑا۔ پلٹ کر اس نے دیکھا۔ اب وہ مسکرا رہا تھا۔ سامنے سے ایک موٹر آہستہ آہستہ جا رہی تھی جس میں جنت کی حوریں۔ کوہ قاف کی پریاں۔ نرالی بانکی اداؤں کیساتھ جلوہ افروز تھیں۔ موٹر کے پیچھے بینڈ تھا۔ اور بینڈ کے پیچھے ایک خاص قسم کا باجہ جس کی آواز بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے زیادہ دہشتناک تھی۔ موٹر والی حسین عورتیں دل لبھانے والے انداز کے ساتھ کاغذ کے پرزوں سے سڑک کو

---

[1] جنوبی افریقہ کے اس شہر کا بڑا بازار جہاں ہندوستانیوں کی کافی آبادی ہے۔ ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد جنوبی افریقہ کی گورنمنٹ کا دماغ بھی اب صحیح ہو چلا تھا۔ ہندوستانیوں کیساتھ برتاؤ بھی پہلے سے اب اچھا ہونے لگا تھا۔

ڈھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن اُن کی یہ کوشش محض بیکار تھی کیونکہ ابھی وہ کاغذ کا پُرزہ گرنے بھی نہ پایا تھا کہ مخلوق پاگلوں کی طرح دوڑ کر اس کو جھپٹ لینے کی کوشش کرتی تھی۔ گویا وہ بیکار کاغذ کا پُرزہ سو روپے کا نوٹ تھا۔

دلاور کو بھی ایک پرزہ مل گیا۔ یہ تھیٹر کا اشتہار تھا۔ کل رات کو ساڑھے نو بجے موتی محل تھیٹر میں ایک ایسا ڈرامہ دکھایا جائے گا جو آج تک دنیا کے پردے پر کسی تھیٹر کمپنی نے نہ دکھایا ہوگا۔ دلاور نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ”ہیں صرف ایک آنہ“ تب تو وہ اس عجیب و غریب ڈرامہ کو دیکھنے سے محروم رہے گا۔ کیا کیا جائے؟.... قرض..... ”ہاں۔

لیکن قرض کون دیگا۔؟ زمانہ جانتا ہے کہ دلاور کو قرض دینا، پیسہ کو پانی میں پھینک دینا ہے۔ ”پھر“۔؟ لیکن کچھ بھی ہو، ڈرامہ تو وہ ضرور دیکھے گا۔ مگر کیسے ؟ ٹکٹ کے دام؟“ دلاور سوچ میں پڑ گیا۔ آج اُس کی قسم ٹوٹ کر رہے گی۔ پانچ برس کی جیل بھگتنے کے بعد اُس نے قسم کھائی تھی کہ آئندہ کبھی چوری نہ کریگا مگر آج کوہ قاف کی پریوں نے اس پر کچھ ایسا جادو کر دیا کہ بیچارہ دلاور اپنی قسم توڑ کر چوری کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کاہے کے لئے؟ صرف پرستان میں ان پریوں کی ایک ادا دیکھنے کو۔

باب ۲

”کون ؟..... کون ہے ؟“

رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ ہر ایک جاندار اپنے مسکن میں دنیا و مافیہا سے

بے خبر آرام و چین کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مغرور تاریکی
سارے عالم پر حکومت کر رہی تھی لیکن غرور کا سر نیچا۔ کبھی کبھی بجلی صرف تاریکی کا
غرور توڑنے کے واسطے ساری دنیا کو لحظہ بھر کے لئے منور کر دیتی تھی۔ سڑک پر
ایک شخص کالا کمبل اوڑھے تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ ایسی موسلا دھار بارش اور
اندھیری رات میں اور پہر کے بارہ بجے، اس کو ایسی کیا پڑی تھی جو اپنا نرم و گرم
بستر چھوڑ کر اسطرح بھیگتا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

اب وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ شہر سے نکل کر ویرانے کی طرف
سڑک پر دوڑنے لگا۔ اب اس نے اسطرف کا رخ کیا جہاں کچھ افسران اور کروڑپتی
تجار تندرستی کی خاطر شہر سے دور بنگلوں میں آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ تھوڑی
دیر بعد یہ کالے کمبل والا عجیب و غریب انسان ایک مشہور کروڑپتی تاجر سیٹھ محمود بھائی
کے بنگلے کے قریب کھڑا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ الغرض دیوار پھاند کر وہ باغ میں داخل
ہوا۔ دو منٹ بعد وہ بلی کی طرح دبے پاؤں بنگلے کے برآمدے میں سے ہو کر ہال
میں داخل ہو رہا تھا۔ بنگلہ اس قدر تاریک تھا کہ بھوتوں کا معلوم ہوتا تھا۔ اُسنے
اپنے چھوٹے سے ٹارچ کو ہوشیاری سے روشن کیا اور ہال کی چیزوں کا یکے بعد
دیگرے معائنہ کرنے لگا۔ میزوں کی ساری درازیں اُس نے کھولیں اور بند کیں۔
لیکن کوئی چیز مطلب کی نہ پا کر وہ بڑے روم میں داخل ہوا۔ اپنے ٹارچ کی روشنی
میں مسہری کے قریب میز پر اُس نے ایک چیز دیکھی۔ دلآویز کی رال ٹپک پڑی آہستہ
سے اُس نے اس قیمتی شئے کو اٹھا لیا۔ یہ سچے موتیوں کا ہار تھا جو سیٹھ محمود نے اپنی لاڈلی
اکلوتی لڑکی سلطانہ کو اس کی سالگرہ کے دن کل ہی دیا تھا۔ سلطانہ نے رات کو

اُسے میز پر اُتار کر رکھ دیا تھا۔ پھر وہ ذرا لیٹ گئی تھی (آج وہ ٹینس کا میچ جیت کر بیحد
تھک گئی تھی) اُس نے خیال کیا کہ وہ ابھی اُٹھ کر ہار کو حفاظت کے ساتھ سیف میں
بند کر دے گی۔ مگر نیند کی دیوی نے کچھ ایسی لوری دی کہ بیچاری سلطانہ پچاس ہزار
کی مالیت سے غافل ہو کر گہری میٹھی نیند سو گئی۔ الغرض ہار حفاظت کے ساتھ مسٹر
دلاور کے کوٹ کی جیب میں رکھا گیا۔

مسہری کے قریب والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ بجلی چمکی اور اس کی سفید شفاف
روشنی میں دلاور نے سلطانہ کے منور چہرے کو دیکھا۔ "اُف، کتنی خوبصورت نوجوان
لڑکی ہے" دلاور اپنے مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ اتنے میں کھٹکا ہوا اور وہ چونک پڑا۔
اب وہ دبے پاؤں بڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم سے ہوتا ہوا برآمدے میں سے
گزر رہا تھا کہ اس کو خیال آیا اگرچہ اس کے پاس ایک قیمتی شے تھی تاہم وہ کل تھیسٹر دیکھنے
سے محروم رہے گا کیونکہ ہار کا اتنے جلد اور خصوصاً اس شہر میں فروخت ہونا ناممکنات میں تھا۔
کل شہر کے ہر اخبار میں سلطانہ کے قیمتی ہار کی چوری کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور ہوگا۔ دلاور
ایک منٹ برآمدہ میں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اُلٹے پیروں چلا اور اب وہ سیٹھ محمود کے
بڈ روم میں مشہور تاجر کے کپڑوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ سارے کپڑے اُس نے دیکھ
ڈالے۔ اس کی نا اُمیدی بڑھتی جاتی تھی۔ الغرض وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑا اسکی
اُنگلیوں کی پوروں کو نوٹوں کا احساس ہوا وہ اپنے ٹارچ کی روشنی میں اُن کو گن
رہا تھا۔ دس دس روپئے کے دس نوٹ۔

اُس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ کل رات کو ساڑھے نو بجے موتی محل تھیٹر
میں۔ آخر کار بکس اُس کے لیے ریزرو ہوگا۔ اتنے میں سیٹھ محمود نے کروٹ بدلی۔ کھانسا

اور اپنی کرخت آواز میں ڈپٹ کر کہنے لگا۔

"کون؟" "کون ہے"؟

دلاور چونک پڑا۔ بھاگ کر کھڑکی تک آیا۔ پاؤں چوڑ کر نیچے کودا اور رات کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔ ایک منٹ تک "چرر چرر" کی آواز اُس کے کان کے پردے کو چھیدتی رہی۔ پھر بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور موسلا دھار بارش کی آواز کے آگے نیست و نابود ہوگئی۔

باب ۳

"اگر اس کا بس چلتا تو..."

ٹھیک ساڑھے نو بجے موتی محل تھیٹر کے اسٹیج کا پردہ اُٹھا۔ دلاور شاید باکس میں بیٹھا ہوا للچائی ہوئی نظروں سے پرستان کی سیر کر رہا ہوگا۔ لیکن نہیں اپنے دوستوں کے ساتھ فرسٹ کلاس میں بیٹھا پلٹ پلٹ کر وہ باکس والی کسی حسین دوشیزہ کو گھور رہا تھا۔ (ڈرامہ کی جیسی تعریف کی گئی تھی ویسا نہ تھا)۔

اس ایک دوست اصغر نے کہا۔

"دلاور، تماشہ دیکھتے ہو یا..."؟

"اونھ" دلاور نے کہا۔ "ذرا دیکھ تو سہی"۔ اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا۔ "کتنی حسین لونڈیا ہے۔ ذرا اُبھار تو دیکھو اس ظالم کا۔ ہائے تری کافر جوانی...، کاش آج کی رات... ... ..."

دلاور خاموش رہا۔

اصغر:۔ "یہ سیٹھ محمود بھائی کی لڑکی سلطانہ ہے۔ اس کا حسن تو شہرۂ آفاق ہے" مسکرا کر "تم جیسے کالے بغلول پہ تو وہ تھوکے بھی نہیں"

"پگلے" جھنجھلا کر دلاور بولا۔ "اچھا بیٹا، ایک دن دیکھ لینا۔ اگر تیری ان تلی جیسی آنکھوں کے سامنے اسی اُٹھتی کونپل کی باہیں میرے گلے میں نہ ہوں تو میرا نام آج سے دلاور نہیں بزدل"

"ہنہ" ہنس کر دلاور کا مذاق اُڑاتے ہوئے اصغر نے کہا "ہاں تو بھائی دلاور وہ کون سا دن ہوگا۔ شاید قیامت کا۔۔۔ یا سفید جمعرات"؟

دلاور کو غصہ آگیا۔ دانت پیستے ہوئے اُس نے کہا۔ "اچھا تو وہ دن تجھے بتا ہی دوں۔ آج کونسا دن ہے"؟

اصغر:۔ "اتوار"

دلاور:۔ "اتوار؟ ۔۔۔ کل کون سا دن ہوگا"؟

اصغر (مسکرا کر) "پیر"

"نکال اپنی نوٹ بک" حقارت سے دلاور نے کہا۔ اور لکھ لے پیر کے دن شام کے چھ بجے اور رات کے بارہ بجے کے درمیان لڑکی اپنے مکان سے غائب ہو کر تیری ان چندھی آنکھوں کے سامنے دلاور کی گود میں بیٹھی ہوگی"

"لکھنے کی کیا ضرورت ہے"! اصغر نے مسکرا کر کہا۔ میری یادداشت اُسکے حسن اور تیری بدصورتی کی طرح شہرۂ آفاق ہے"

"دلاور نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اُف کتنی کراری لونڈیا ہے کمبخت"

ایک بیس سالہ خوشرو نوجوان ان بدمعاشوں کے قریب بیٹھا ہوا ان کی گفتگو کان دھر کر سُن رہا تھا۔ یہ غریب اپنے دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اگر اس کا بس چلتا تو دلاور کی گردن گھونٹ کر اس کے جسم کی بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیتا۔

باب ۴

"کوئی اختر کے دل سے پوچھے"

پیر کے دن شام کو جانسن کالج میں شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ "مرچنٹ آف وینس" دکھائے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

پورشیا کا پارٹ سلطانہ کو ملا تھا اور انٹونیو کا اختر کو۔ یہ وہی بیس سالہ خوشرو نوجوان تھا جو تھیئٹر میں دلاور اور اس کے دوستوں کے پاس بیٹھا ہوا اُن کی گفتگو سُن سُن کر آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ سلطانہ اور اختر ایک ہی درجے میں پڑھتے تھے۔ اختر دل و جان سے سلطانہ پر نثار تھا مگر اس کی محبت کسی پر ظاہر نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ سلطانہ کو بھی علم نہ تھا کہ اختر اُسے چاہتا ہے۔

اختر کالج کی لڑکیوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ سلطانہ سے بھی شاذ و نادر ہی گفتگو ہوتی تھی۔ گو دل سے تو وہ یہی چاہتا تھا کہ گھنٹوں بیٹھ کر سلطانہ سے باتیں کیا کرے لیکن جب سلطانہ اُس سے مخاطب ہوتی۔ اختر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ ہاتھ پیر برف ہو جاتے اور کسی نہ کسی بہانے سے اسکو اُٹھنا پڑتا۔

بہرحال سلطانہ کی زبان سے نکلے ہوئے وہ چند الفاظ اُس کے دل کی کتاب کے پہلے ورق میں درج ہو جاتے۔

لیکن ادھر ایک ہفتہ سے ڈرامہ کی پریکٹس اور ریہرسل کے سلسلہ میں سلطانہ اور اختر میں پہلے سے زیادہ بات چیت ہونے لگی تھی لیکن یہ سب ڈرامہ کے متعلق تھی۔ اختر کے دل میں جو ڈرامہ ہو رہا تھا سلطانہ کو اسکا کیا پتہ۔

ایک دن ڈرامہ کی پریکٹس میں سلطانہ نے اختر سے اپنی شیریں آواز میں کہا تھا "اختر صاحب! آپ ان کپڑوں میں بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں"۔ وہ کچھ جھینپ سا گیا تھا۔ سلطانہ زور سے ہنس پڑی تھی۔ آہ! وہ ہنسی کی آواز کیسی پیاری تھی۔ کوئی اختر کے دل سے پوچھے۔

یہ اختر تھا کون؟ ... ... بیچارہ اختر ایک غریب آدمی کا لڑکا تھا۔ اس کے باپ کا انتقال اس کے بچپنے ہی میں ہو چکا تھا اور مصیبت زدہ ماں نے سلائیاں سی سی کر، فاقے کر کر کے اپنے لاڈلے اختر کو میٹرک تک تعلیم دی تھی۔ اختر ذہین اور عقلمند تھا۔ اُس نے اپنی بیوہ مصیبت زدہ ماں کی محنت و مشقت کی کمائی ہوئی ایک ایک پائی کی قدر کی اور اس کو سو روپیہ کا نوٹ سمجھکر پڑھنے میں جان توڑ محنت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اختر میٹرک میں تین ہزار طالب علموں میں اول آیا۔ اور یونیورسٹی کی طرف سے اسکو پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ ماں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اختر کی ہمت بڑھ گئی اور اب سوائے پڑھائی کے اُسے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ لیکن نہیں۔ پڑھتے پڑھتے سلطانہ کی یاد اُس کو بےچین کر دیتی اور وہ کتاب بند کر کے عشق کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔ پھر وہ اپنے آپ سے سوال کرتا۔

"سلطانہ کو کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے"؟

"دنیا میں شہرت اور روپیہ حاصل کر کے"۔

"شہرت اور روپئے کیسے مل سکیں گے"؟

"تعلیم حاصل کر کے"۔

وہ اپنی کتاب کھول کر پڑھنے لگتا اور پھر ایسا غرق ہو جاتا کہ اُسے کھانے کی بھی پرواہ نہ رہتی۔

اختر کالج بھر میں ہر دلعزیز تھا کئی مرتبہ کالج کے ڈراموں میں اُسے انعامات مل چکے تھے۔ اس دفعہ بھی اختر نے اپنا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا کہ تالیاں بجاتے بجاتے لوگوں کے ہاتھ دُکھ گئے۔ اور "گولڈ کپ" اُسے انعام میں دیا گیا۔ "سلور کپ" سلطانہ کو ملا۔

باب ۵

"لیکن اُس کی سانس رُک گئی"

"ساڑھے دس بجے رات کو جانسن کالج میں ڈرامہ دیکھ کر لوگ اختر کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔

سلطانہ کالج کے باہر آئی لیکن اپنی کار کہیں اسکو نظر نہ پڑی۔ "بدمنی" اُس نے اپنی ایک ہندو دوست سے کہا "میری کار ابتک نہیں آئی۔ تعجب ہے۔ کیا تم اپنی کار میں مجھے گھر تک چھوڑ سکتی ہو"؟

"ہاں۔ ہاں۔ پدمنی نے ہنسکر جواب دیا" آؤ نا۔ گھر تک کیا۔ میں تو تمھیں

تمھارے دولھا کے گھر تک چھوڑ آؤں گی"۔

"چپ شریر۔ سلطانہ نے پدمنی کو مذاق سے چھیڑتے ہوئے کہا۔ اور اسکے

ساتھ موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر پچاس میل فی گھنٹہ کی تیز رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی

چلی جارہی تھی۔

ہاں یہ تو بتاؤ۔ مسکراکر مذاقاً پدمنی نے کہا۔

"پیاری سلطانہ کبتک دلہن بنیں گی"

سلطانہ بولی" جب پدمنی کی شادی ہو جائے گی تب"

"پدمنی کی شادی" سلطانہ کی ران پر مکار سید کرتے ہوئے پدمنی نے دانت

پیس کر کہا" پدمنی کی شادی تو ہو گئی"

"کبوتر کے ساتھ" ؟ پیشانی پر شکن ڈال کر مسکراتے ہوئے سلطانہ نے پوچھا۔

"نوج" پدمنی منھ بناکر بولی" موئے کبوتر کے ساتھ کاہے کو ہوتی۔ بوی

اگر تم اُن کو دیکھ لو تو سچ کہتی ہوں منھ میں پانی بھر آئے۔ کیا حسین بانکا نوجوان

ہے۔ اُبھرا ہوا سینہ۔ گول گول بازو۔ دل چاہتا ہے کہ بس... ..."

"کون ہے ؟" سلطانہ نے پوچھا۔

"منشی لال" پدمنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ راجہ گنگا پرشاد کا اکلوتا لڑکا"

"گدھا" سلطانہ بولی۔ پدمنی میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں کہ ایسا ہونہار

لونڈا تمھارے حصہ میں آیا۔ کیا بات بالکل پکی ہو گئی ہے" ؟

"بالکل" ہنستے ہوئے پدمنی نے کہا۔ مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میری

شادی بھی ہو چکی کیونکہ ایک منٹ کیلئے بھی تو وہ مجھے جدا نہیں ہونے دیتے۔ خواب میں۔ خیال میں۔ جاگتے میں۔ سوتے میں۔ کالج میں۔ کھیل میں۔ گود میں۔ غرض جہاں بھی میں ہوتی ہوں۔ موجود رہتے ہیں "۔

" تو گویا وہ آپ کے ہمزاد ہیں "۔ سلطانہ نے مسکرا کر کہا۔

" اچھا بھئی اب تم بتاؤ "۔ پدمنی بولی "۔ تمہاری شادی کب تک ہو رہی ہے۔ سنا تھا کہیں ٹھہری ہے "؟

" میری شادی "، سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ کیا پوچھتی ہو بہن، غریبوں کی شادی کا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" ہٹو بھی "، پدمنی نے جھنجلا کر کہا "۔ بتاؤ نا "۔

" کیا بتاؤں "؟ سلطانہ کچھ رنجیدہ سی ہو گئی "۔ کیا بتاؤں تمھیں "؟

" کیا بات ہے "، پدمنی نے سلطانہ کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے کہا " بتاؤ تو میری بہن "

" بہن پدمنی "، سلطانہ نے لمبی سانس لیکر کہا۔ میری شادی ایک ایسے شخص کے ساتھ ہونے والی ہے جس سے میں " رکتے ہوئے وہ بولی " جس سے میں نفرت کرتی ہوں "۔

" وہ موا کون ہے بہن "؟ پدمنی نے پوچھا۔

" میرا خالہ زاد بھائی یوسف علی "۔ جواب ملا۔

" تم اس سے نفرت کیوں کرتی ہو "؟ پدمنی نے سوال کیا۔

" ایک شرابی رنڈی باز جواری سے تم نفرت کرو گی یا محبت "؟ سلطانہ بولی۔

" نفرت "، پدمنی نے کہا "۔ لیکن سلطانہ شادی سے تم انکار کیوں نہیں کر دیتیں سنا ہے

تمہارے والد تو بڑے آزاد خیال ہیں۔"

"امّاں کہتی ہیں کہ اگر میری شادی یوسف سے نہ کی گئی تو وہ زہر کھا کر اپنا خاتمہ کر لیں گی۔ بڑی مشکل میں جان پھنسی ہے، کیا کروں"؟

"یہ تو صرف اُن کی دھمکی ہے" پدمنی گردن ہلا کر بولی۔

"ممکن ہے۔ مگر اُن سے کچھ عجب بھی نہیں" سلطانہ نے موٹر سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ پدمنی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُسکی سانس رُک گئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ ایک دوسری موٹر اسکی کار کے برابر سے چلی جا رہی ہے۔ ٹھیک اُسوقت اس دوسری موٹر سے ایک نقاب پوش پدمنی کے موٹر میں کودا۔ اور سلطانہ کو گود میں اُٹھا کر اپنی موٹر میں اس بیدردی سے پھینک دیا جس طرح ریلوے اسٹیشن پر قلی پارسلوں کو پھینک دیا کرتے ہیں پھر خود اپنی موٹر میں کود پڑا۔ اور آناً فاناً میں موٹر نظروں سے غائب ہو گئی۔

پدمنی کی سانس نیچے کی نیچے اور اوپر کی اوپر تھی۔ اس کا دل بانسوں اُچھل رہا تھا۔

"گنگا" ہانپتے ہوئے اُس نے ڈرائیور سے پوچھا "یہ کون لوگ تھے"؟

ڈرائیور بھی گھبرایا ہوا تھا۔ وہ اپنے دل میں "جان بچی لاکھوں پائے" کا وظیفہ پڑھ رہا تھا کھانستے ہوئے بولا "بائی، پرمیشور جانے کون بدمعاش تھے۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ جب وہ نقاب پوش اپنی گاڑی میں کودا۔۔"

ابھی کچھ اور کہتا مگر چونک پڑا۔ ایک دوسری موٹر زن سے اُس کے قریب سے نکل گئی اور اُسی سمت میں گئی جس میں اُن بدمعاشوں کی موٹر گئی تھی۔

باب ٦

"ٹھیک اُسی وقت ایک موڑ آئی"

ٹیکسی ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ لیکن تب بھی اختر ڈرائیور کو ٹھونسے دے دے کر بار بار کہہ رہا تھا "تیز اور تیز، رفتار تیز کر دو نا"؟

الغرض ٹیکسی کی روشنی میں اختر نے اُس کار کو دیکھا جس کا وہ پیچھا کر رہا تھا۔ دونوں سمندر سے پانچسو فیٹ کی بلندی پر اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھیں۔ اختر ہاتھ میں پستول لیے ہوئے (جو اُس نے آج شام کو کسی سے عاریتاً لیلیا تھا) سلطانہ کو بدمعاشوں کے پنجے سے چھڑانے کی فکر میں اس قدر غرق تھا کہ اس کو پانچسو فیٹ نیچے خوفناک سمندر کے دہشتناک منظر کی کوئی پرواہ نہ تھی (اگرچہ ہر سکنڈ ہر لحظہ پر یہ خوف تھا کہ اب دونوں موٹروں میں سے ایک پانچسو فیٹ نیچے سمندر میں گرا چاہتی ہے)

اختر بار بار کہہ رہا تھا "تیز اور تیز کر دو نا" اور ٹیکسی ڈرائیور منھ ہی منھ میں کچھ بڑ بڑا رہا تھا۔

اب دونوں موٹروں میں صرف چند ہی گز کا فاصلہ ہوگا۔ نقاب پوش نے اپنی کار سے فائر کیا جو خالی گیا۔ اختر نے اس کا جواب دیا مگر یہ بھی نشانے پر نہ لگا۔ اختر کو یہ بھی خوف تھا کہ کہیں اس کی گولی بدمعاش نقاب پوش

کے بدلے اُس کی پیاری سلطانہ کے نہ لگ جائے۔ یہ پہلا موقع تھا جو پستول اُسنے ہاتھ میں لیا تھا۔ یہ سوچکر دوسرا فائر کرتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔ ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ تڑسے ایک آواز ہوئی اور اُس کا ڈرائیور ایک آہ دلسوز کے ساتھ سیٹ سے دو فیٹ اُچھل کر اسٹیئرنگ پر جھک گیا۔ ٹھیک اُسیوقت ایک موڑ آیا مگر موڑنے والا تو ختم ہو چکا تھا۔ ٹیکسی اپنی پوری رفتار کے ساتھ مع اختر اور مردہ ڈرائیور کے پانچسو فیٹ نیچے سمندر میں کود پڑی۔

باب ۳

"وہ بیہوشں تھی"

شہر سے تقریباً پچاس میل دور پہاڑوں سے گھرے ہوئے دہشتناک جنگل میں کچھ لوگ پتھروں پر بیٹھے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ نقاب پوش نے نقاب اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اصغر آج کون سا دن تھا"؟

"پیر"، اصغر نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"پیر"، دلاور (نقاب پوش) مسکراتے ہوئے بولا۔ "اور اسوقت کیا بجا ہے"

"بارہ بجنے میں تین منٹ"۔ اصغر نے سوکھے منہ سے جواب دیا۔

"تونے دیکھا"۔ سوکھا سا قہقہہ لگا کر حقارت سے دیکھتے ہوئے دلاور بولا۔

"دلاور جو کہتا ہے وہ کر کے دکھا دیتا ہے۔ کل رات تھیٹر میں تو میرا مذاق اُڑا رہا تھا۔ اب اپنی بلی جیسی آنکھوں سے دیکھ، سلطانہ کس کی گود میں ہے، اُسی کالے بغلول کی؟ اور ابھی ذرا یہ ہوش میں آجائے تو تیری ان خُند ہی آنکھوں کے سامنے اس کی باہیں بھی اسی کالے بغلول کے گلے میں ہوں گی۔ دوسرا قہقہہ لگا کر اُس نے کہا "ہنہ" اب تو کیوں بولنے لگا۔ دیکھی دلاور کی دلاوری۔ بول، بول، خاموش کیوں بیٹھا ہے"؟

اصغر گردن جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اُس کے پانچوں دوست بیٹھے ہوئے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ آخر کار اصغر نے گردن اُٹھائی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی لمبا گھونٹ کر آیا ہے الغرض مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا "دلاور واقعی تم نے بڑا کام کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میں اسقدر ہمت ہے۔ لیکن شاید یہ تم نے نہیں سوچا" ذرا رُکتے ہوئے وہ بولا "کل کیا ہوگا"؟

"کل کیا ہوگا" دلاور نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا "پولیس تفتیش کرے گی اور جان توڑ کر کرے گی کیونکہ یہ ایک مالدار کی لڑکی ہے۔ مگر جانتے نہیں میں بھی تو پولیس سے زیادہ ہوشیار ہوں۔ پولیس کے ان کتوں کو ایسے ایسے چکمے دیئے ہیں کہ وہ بھی یاد ہی کرتے ہوں گے"

"لیکن ان پانچوں میں سے ایک بولا" یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پیچھا کرنے والا کون شخص تھا"؟

"ہوگا کوئی پولیس کا کتا" لاپرواہی سے دلاور نے جواب دیا "خیر

اب تو وہ بیٹے ٹھنڈے پانی کی تہ میں چین کی نیند سو رہے ہوں گے۔
سلطانہ ابتک دلاور کی گود میں بیہوش پڑی تھی اور دلاور بےچینی سے
اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

باب ۸

"تم لوگ جاؤ، محفل برخاست"

سُلطانہ کا ہونیوالا شوہر یوسف علی شراب کے نشہ میں مست حُسن آرا طوائف کے کوٹھے پر بیٹھا ہوا ناچ اور گانے کے مزے لے رہا تھا۔ حُسن آرا کھڑی ہوئی اپنی گوری گوری باہیں سجا سجا کر کوٹھے ٹھکار رہی تھی۔ کبھی انگڑائی لیکر اپنی مست جوانی کا اُبھار دکھا دکھا کر نیم برہنہ چکنی چکنی رانوں کو بل دینے لگتی۔ اور کچھ اس طرح سے اپنے سارے جسم کو ہلاتی کہ لوگوں کو پھریری سی آجاتی اور وہ ایک سسکی لیکر رہ جاتے۔

حُسن آرا نے یوسف کی طرف ایک ادا سے دیکھا۔ پھر انداز سے اس کو اشارہ کر کے گانے لگی "دل یہ کہتا ہے دلربا تو ہے"۔ ہاں دل یہ ..... "آنکھ کہتی ہے بیوفا تو ہے" ہاں آنکھ کہتی ہے

"کیا خوب"۔ یوسف نے تالی بجا کر کہا۔ کیا پیاری آواز ہے۔ خدا کی قسم کیا گلا پایا ہے"۔ حُسن آرا کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر وہ بولا۔ "آؤ پیاری بس کرو

یہ گانا۔ آؤ اب تو دل کی پیاس بجھا دو۔"

حُسن آرا مسکراتی ہوئی اور گاتی ہوئی یُوسف کی طرف بڑھی۔

آئینہ تیری قدر کیا جانے ہاں ہاں آئینہ تیری
میری آنکھوں سے پوچھ کیا تو ہے

اب وہ یوسف کے گلے میں باہیں ڈالے اُس کی گود میں بیٹھی اس کے بالوں سے کھیل رہی تھی۔

"بس اب تم لوگ جاؤ۔ محفل برخاست۔"

اس کی آواز میں نہ معلوم کیا تاثیر تھی کہ ہر ایک شخص اپنے دل میں اسکی جان کو دعائیں دیتا ہوا طوائف کے کوٹھے سے نیچے اتر گیا۔

جب سب چلے گئے تو حسن آرا نے شراب کے دو جام بھر کر ایک یوسف کو بڑھاتے ہوئے کہا "لو پیارے۔"

یوسف نے ایک ہاتھ سے جام لیا اور دوسرا حسن آرا کے گلے میں ڈالکر گانے لگا۔"

بھر بھر کے جام پلا" .. .. گل لالہ بنا دے۔ متوالا۔ تو لا۔ لا۔ لا۔ لا۔
.. .. فصل بہار ہے۔ جوبن نکھار ہے .. .. .. شیشے میں مے ہے۔
.. .. پہلو میں یار ہے .. .. .. تو لا۔ لا۔ لا۔ لا۔ بھر بھر کے جام پلا"

ہاتھ بڑھا کر حسن آرا نے بتی گل کر دی۔ پھر ایک ہلکی سی آہ اُسکے منہ سے نکلی اور اب یہ دونوں دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو چکے تھے۔

باب ۹

"خشکی کا میلوں پتہ نہ تھا"

جس کو خدا رکھے اُسے کون چکھے۔ اختر ٹیکسی سمیت پانی کی تہ میں پہونچ چکا تھا لیکن قدرت کو تو ابھی کرشمہ دکھانا مقصود تھا۔

تھوڑی دیر بعد اختر ایک لٹھے کے سہارے بہتا ہوا چلا جا رہا تھا اور اب یہ لٹھا بہتا ہوا ایسی جگہ نکل آیا تھا۔ جہاں خشکی کا میلوں پتہ نہ تھا۔ اسوقت اسکے دماغ کو صرف ایک خیال پاش پاش کئے دیتا تھا اور وہ یہ اسکی پیاری محبوبہ سلطانہ بدمعاشوں کے پھندے میں ہوگی۔ گرم گرم آنسو اُس کی ہرن جیسی آنکھوں سے نکل نکل کر سمندر کے نیلے پانی میں مل رہے تھے۔ دفعتاً اُسکے منہ سے نکلا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

باب ۱۰

"یکایک اُس نے ڈپٹ کر کہا"

دو گھنٹے ہو گئے مگر سلطانہ ابتک ہوش میں نہیں آئی۔ ولاور نے سگوگو

سے اُتار کر زمین پر لٹا دیا۔ اور خود اُٹھ کر کچھ سوچتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ اصغر اُٹھ کر نہ معلوم کہاں چلا گیا۔ اور اس کے پانچوں دوست پھر پھیل کر خرّاٹے لینے لگے۔ سلطانہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں لیکن دلاور کو اپنے قریب سے گزرتا دیکھ کر پھر بند کر لیں اور جب دلاور کے جوتوں کی آواز ذرا دور سنائی دی تو اُس نے پھر ہوشیاری سے تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دلاور کی پیٹھ اُس کی طرف تھی اور وہ ٹہلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سلطانہ نے گردن اُٹھا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ وہ پانچوں پڑے خوب زور و شور سے خرّاٹے لے رہے تھے۔ یہ آہستہ سے اُٹھی اور ان سونے والوں میں سے ایک کے قریب جا کر (جو سب سے زیادہ خرّاٹے لے رہا تھا) اُس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ٹھیک اُسوقت دلاور نے پیٹھ موڑ کر اس کی طرف کیا۔ اب وہ سلطانہ کی طرف جھپٹا ہوا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اب تک وہ سونے والے کی جیب سے پستول نکال چکی تھی جس کی نال دلاور کے دل کی سیدھ میں تھی۔

"خبردار" ڈپٹ کر اُس نے کہا "ہاتھ اونچے کرو۔ ورنہ جان لو خاتمہ قریب ہے"۔

اب دلاور کے دونوں ہاتھ اس کے سر سے اونچے تھے۔ وہ دل میں پچھتا رہا تھا کہ اس کو اپنی گود سے اُتار کر وہ کیوں ٹہلنے لگا تھا۔ وہ پانچوں گھوڑے بیچ کر اب تک پڑے سو رہے تھے۔

"خبردار" سلطانہ نے دلاور کو گھورتے ہوئے کہا۔ اگر ذرا بھی آواز نکالی تو سمجھ لے گولی تیرے سیاہ دل کے آر پار ہو جائے گی۔ سمجھ گیا"

دلاور کھڑا پیشانی پر بل ڈالے اپنے نیچے کے ہونٹ کو چبا رہا تھا۔ اسکی

آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔

یکایک سلطانہ نے ڈپٹ کر کہا۔

"ہیلو پیچھے ہٹو۔ اور ہٹو۔ ہٹتے جاؤ۔"

سلطانہ کی پیٹھ کے پیچھے تین فرلانگ پر آصف بے فکری سے سیٹی بجاتا ہوا چلا آرہا تھا۔

باب ۱۱

"مگرمچھ چند گز کے فاصلہ پر"

سمندر میں تلاطم تھا۔ اختر سو سو فیٹ اونچے اُٹھکر پانی کی موجوں کے درمیان دفن ہوجاتا تھا۔ اگرچہ اب وہ خشکی سے زیادہ دور نہ تھا۔ تاہم پانی کی ہر موج موت کا پیغام نظر آرہی تھی۔ اختر حسرت سے آسمان کی طرف نظر اُٹھاتا مگر بیرحم چرخ اس غریب کی طرف لاپرواہی سے دیکھکر مسکرا دیتا۔ اُسوقت بھی سلطانہ اس سے دور نہ تھی۔ جب خوفناک موج اسکو آسمان کی طرف لیجاتی تو اختر ہر ستارے میں اپنی محبوبہ کو روتے ہوئے پاتا۔ یہ اُس سے رونے کا سبب پوچھتا۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتی۔ "پیارے اختر۔ کیا پوچھتے ہو، بدمعاش میری عزت کے پیچھے پڑے ہیں۔ آہ۔ تم اپنی جان میرے لیے مفت میں کیوں دے رہے ہو۔ جاؤ۔ جاؤ۔ دیکھو تمہاری

مصیبت زدہ بوڑھی ماں جس کے گھر کا اُجالا۔ جسکی زندگی کا سہارا۔ جس کی آنکھوں کا تارا۔ جس کی خوشی صرف تم ہو۔ تمھارے لئے اپنی جان رو رو کر ہلکان کیئے دے رہی ہے۔ جاؤ پیارے اختر جاؤ۔ اس غریب کی تمناؤں کا خون نہ کرو۔ بڑھاپے میں اس کے غمزدہ دل کو شیشے کی طرح پتھر پر نہ مارو۔ ابھی تمھاری شادی ہونا ہے۔ تمھیں نوشہ بنا کر اس کے مردہ دل میں نئی زندگی اس کی بوڑھی روح میں تازگی پیدا ہوگی۔ جاؤ پیارے اختر جاؤ۔ اپنی قیمتی جوان جان سلطانہ کے لیئے یوں برباد نہ کرو۔۔۔ ۔۔ جاؤ پیارے اختر جاؤ۔"

اختر کی آنکھیں آنسوؤں کا دریا بہا بہا کر سمندر کے تموج کو سہ چند کر رہی تھیں۔ یکایک ایک دیو کی آواز کے ساتھ ایک بڑی لہر نے اسکو خشکی پر پھینکدیا۔ اس کا سر ایک بڑی چٹان سے ٹکرایا اور خون جاری ہو گیا۔

یہ وہ مقام تھا جہاں ایک بڑی ندی سمندر میں آ کر گری تھی۔ اکثر یوروپین شکاری اس ندی میں مگر کا شکار کھیلنے آیا کرتے تھے۔

اختر خشکی پر بےحس و حرکت پڑا تھا اور ایک مگرمچھ چند گز کے فاصلہ پر للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

باب ۱۲

"سب جاگ پڑے"

اصغر بحر تخیل میں غرق سیٹی بجاتا ہوا خراماں خراماں چلا آ رہا تھا کہ یکایک

اُس کی نظر سلطانہ کی پُشت پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہے کہ سامنے اس کا دوست دلاور بہت اونچے ہاتھ کیے روتی صورت بنائے پیچھے ہٹتا چلا جا رہا ہے۔ اصغر وہیں ٹھٹک گیا۔ مسکراہٹ کی ایک لہر اُس کے ہونٹوں پہ دوڑ گئی اور اب راستہ کاٹ کر یہ سلطانہ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

"بیگم" اصغر نے تعظیم سے سر جھکا کر کہا "مجھے حضور کا خادم سمجھئے۔ میں سرکار کو اس بدمعاش کے پھندے سے نکالنے کی انتہائی کوشش کروں گا"

"دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو" سلطانہ نے دونوں پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم بھی اسی کے ساتھی ہو۔ بھلا اسوقت گئی رات کو تمہارا ایسے گھنے خوفناک جنگل میں ہونا کیا معنی؟"

"بیشک میں اسی کا ساتھی ہوں" اصغر سچ بول دیا۔ مگر حضور آپ کے یہاں لانے میں میں نے ہرگز اسکا ساتھ نہیں دیا ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ ..."

"بس" سلطانہ پستول ہلاتے ہوئے بولی "تم میرا خیال بٹانے کی کوشش نہ کرو۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے"

"بیگم" اصغر نے یقین دلانے کی کوشش کی "خدا گواہ ہے۔ میں آپ کو دھوکہ نہیں دے رہا ہوں۔ میں آپ کو اس شیطان سے" اس نے دلاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس شیطان سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جلدی کیجیئے خدا کیواسطے بیگم جلدی کیجیے۔ ورنہ اگر کہیں ان بدمعاشوں میں سے کسی ایک کی بھی آنکھ کھل گئی تو مشکل ہو جائے گی۔ پھر آپ کا خدا ہی حافظ ہے بیگم۔ مجھے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی اجازت دیجیئے تاکہ میں اس بدمعاش کو رسی سے کس لوں اور اُن

پانچوں کے پستول نکال کر اُن کو بھی باندھنے کی کوشش کروں۔ مجھے ایک تھوڑا سا لالچ ضرور ہے۔ وہ یہ کہ آپکے والد سیٹھ محمود بھائی سے تھوڑی سی رقم انعام کے طور پر حاصل کر سکوں گا۔"

اصغر کے الفاظ میں سچائی کی جھلک تھی۔ سلطانہ کو اگرچہ اس کی ان باتوں پر پورا یقین نہ تھا تاہم اس نے اصغر سے اپنی شیریں آواز میں کہا۔

"اچھا اپنا کام انجام دو" کیونکہ بیچاری غریب لڑکی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا دل اس کی پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ اور وہ دل ہی دل میں اپنے پروردگار سے نہ جانے کیا کیا دعائیں مانگ رہی تھی۔

یوں سلطانہ کی اجازت حاصل کر کے اصغر ٹہلتا ہوا دلاور کے پاس پہونچا اور پیچھے سے اُس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالتے ہوئے مسکرا کر آہستہ سے کہنے لگا۔

"ہاں تو اس اُٹھتی کونپل کی باہیں کالے ناگوں کے گلے میں ہیں نا؟"

دلاور کا دل جل بھن کر کباب ہو گیا۔ مگر پستول کی نال اپنی طرف دیکھ کر وہ خاموش ہی رہا۔

پھر اصغر مسکراتا ہوا اُن پانچوں کے قریب گیا اور اُن میں سے چار کے پستول اپنے قبضے میں کئے۔ (کیونکہ اُن میں سے ایک کا پستول تو سلطانہ پہلے ہی اسکی جیب سے نکال چکی تھی۔

اب وہ دو بدمعاشوں کو اُنھیں کی لمبی پگڑیوں سے باندھ کر تیسرے کی پگڑی اُتار رہا تھا کہ اُن دو بندھے ہوؤں میں سے ایک کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس زور سے چلایا کہ سب جاگ پڑے اور اب تو اصغر کی گردن ان میں سے ایک کے ہاتھ میں

تھی۔ اُدھر سلطانہ دلاور کو ایک سکنڈ کے لیے بھول کر ان بدمعاشوں کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ چشم زدن میں پستول اس کے ہاتھ سے غائب ہو کر دلاور کے ہاتھ میں تھا۔

باب ۱۳

"وہ خوشی سے اُچھل پڑا"

صبح صادق تھی جنگل میں کیسا بھلا معلوم ہو رہا تھا نسیم سحری اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی تھی۔ پتہ پتہ تسبیح میں مصروف تھا۔ مرغانِ چمن وجد میں آ کر نئے نئے گیت اپنی شیریں آواز میں خدائے بزرگ و برتر کی شان میں الاپ رہے تھے۔

کچھ آدم خور برہنہ حبشی آپس میں ہنستے ہنساتے اپنی خاص قسم کی کلھاڑیاں چھوٹے موٹے درختوں پر مارتے سمندر کی طرف سے بے ڈھنگے انداز سے اُچھلتے کودتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ایک حبشی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی سرخ سرخ آنکھیں سمندر کے کنارے کسی خاص چیز کو گھور رہی تھیں۔ اب وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں سے اپنی زبان میں آنکھیں پھاڑ کر بڑے بڑے سفید دانت نکالتے ہوئے کچھ کہا اُس کے ساتھیوں نے بھی اس شئے کو دیکھتے کے ساتھ ہی خوش ہو کر آنکھیں پھاڑ کر اپنی اپنی بتیسی نکال دی۔ پھر اُن حبشیوں کا سردار مسکراتا ہوا چند قدم آگے بڑھا اور اپنی کمر پٹی میں سے ایک عجیب قسم کی ٹیڑھی چھری نکال کر نشانہ لیتے ہوئے سمندر کے کنارے اس زور سے پھینکی کہ مگرمچھ (جو اب بہوش اختر کے

بالکل قریب آچکا تھا اور اُس کی ران پر منہ مارنا ہی چاہتا تھا، کے پیٹ کے آر پار ہوگئی۔ گردن موڑ کر جشیوں کو دیکھتے ہوئے انکا سردار اس انداز سے مسکرایا گویا اپنے اچھے نشانے کی داد چاہتا ہے۔

غرض آدم خور جشیوں نے تالیوں سے داد دی۔ پھر لپک کر اختر تک گئے اور اسکو سر سے اونچا اُٹھا کر خوشی کے گیت گانے لگے۔ سردار نے سمندر کے کنارے ہاتھ جوڑ کر پانی کے دیوتا کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ آج دس برس کے بعد آدمی کا لذیذ گوشت وہ مزے لے لیکر کھائیں گے۔

اب وہ اپنی کرخت آواز میں خوشی کا گیت گاتے ہوئے۔ اختر کو سر سے اونچا اُچھالتے ہوئے آپس میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے کودتے پھاندتے گھنے جنگل میں چلے جا رہے تھے۔

باب ۱۴

"وہ بیہوش بنی پڑی تھی"

صبح کے چھ بج رہے تھے۔ یوسف علی حسن آرا طوائف کے گھر میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا چھ مہینے سے بیمار ہے۔ زرد زرد پچکے گال۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے۔ بقول شخصے صورت پہ ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ منہ کھولے ہوئے بیوقوفوں کی طرح سو رہا تھا کہ حسن آرا نے آ کر اسکے

کھلے ہوئے منہ میں ہیپر منٹ کی دو گولیاں ڈالدیں۔ غڑپ غڑپ کر کے وہ نگل گیا۔ اور پھر اکو آنکھیں پھاڑ دیں۔

"ڈھتے نہیں پیلٹ ہے" طوائف نے انداز سے کہا "تم نے آج مجھے شکار کو لیجانے کا وعدہ کیا ہے۔ اٹھو اٹھو" اُس نے یوسف کو گدگداتے ہوئے کہا۔ "منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو" یوسف کی پیشانی کو چومتے ہوئے وہ بولی۔ "اور پھر ہمیں شکار کو لیچلو" یہ کہکر حسن آرا نے اپنا سر یوسف کے سینے پر رکھدیا۔

"ہاں ہاں میری جان" یوسف نے اپنی دلربا کے گداز شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "چلو کتنا ناشتہ کھاؤ گی"

"جتنا کھلاؤ گے" طوائف نے اٹھلا کر کہا "چلو اُٹھو نا"

الغرض کانکتے ہوئے یوسف صاحب اُٹھ بیٹھے۔ اور منہ ہاتھ دھو کر اپنی محبوبہ کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔

"دیکھو جی" حسن آرا نے اپنی سرمگیں آنکھیں چلا کر ناز سے مسکرا کر کہا۔ "آج ہم تم سے خفا ہو جائیں گے"

"کیوں کیوں"؟ چائے کا گھونٹ لیکر پیالی تشتری میں رکھتے ہوئے یوسف بولا۔ آخر وجہ۔ ارے جب تم ہی ہم سے خفا ہو جاؤ گی سرکار" ہنستے ہوئے اُس نے کہا "تو پھر ہمارا بیٹھا ہی کون ہے۔ کس کے لئے ہم جئیں گے"

"اچھا تو" طوائف نے زمین کو گھورتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک اچھی سی ساڑھی لاکے دو"

"بس" یوسف ہنسکر بولا۔ "اتنی سی بات۔ اجی ایک کیا۔ جتنی کہو جانم۔

آخر ہمارے والد صاحب قبلہ کس کے لئے چھوڑ گئے ہیں"۔ اُس نے حسن آرا کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمھارا ہی تو ہے۔ میری کامنی "۔۔ "مگر" حُسن آرا کے ہاتھ سے پورا کا پورا اُبلا ہوا انڈا منہ میں لیکر چبلتے ہوئے وہ بولا "آج تو شکار کو چل رہی ہو۔ کل۔۔ ۔۔"

"کل ول نہیں مجھے تو آج ہی لا کے دو" طوائف نے اٹھلا کر کہا۔ بندوقیں وغیرہ لینے گھر جاؤ گے۔ بازار سے ہماری چیز بھی لیتے آنا" یہ کہکر اُس نے یوسف کے شانے پر سر رکھدیا اور ٹکٹکی باندھکر اُس کے چہرے کو تکنے لگی اور بولی "تو کس قدر حسین ہے میری جان۔ تجھ پرسے میں قربان۔ آہ۔ ایک ٹھنڈی سانس لیکر اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور اب وہ یوسف کی گود میں بیہوش بنی پڑی تھی۔ اور رنڈیوں کی چال کو نہ سمجھنے والا بیوقوف یوسف حسن آرا کے سر کو اپنے زانو پر رکھے ہوئے اسکے منہ پر پانی کے چھینٹے دے دے کر اپنے قمیص کے دامن سے ہوا کر رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں حسن آرا کی ماں ان دونوں کا یہ تماشہ دیکھ دیکھ کر اپنی چھوٹی بیٹی دل آرام کی طرف مُڑ مُڑ کر مسکراتے ہوئے یہ گا رہی تھی ؎

بیمارِ محبت کو گر ہوش میں لانا ہو
زانو پہ لٹا لینا دامن سے ہوا کرنا

باب ۱۵

"اس کا پھل تجھے اچھا نہ ملیگا"

اصغر ایک پرانے بڑ کے درخت میں الٹا لٹکا ہوا تھا اور اس کے نیچے زمین پر آگ سلگ رہی تھی۔ دلاور اور اس کے ساتھی اس کے آس پاس کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ سلطانہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی ہوئی زار و قطار رو رہی تھی۔ کیونکہ نازک وقت آ پہونچا تھا۔ اور اب اس کی عزت کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

ٹھٹھا مار کر بیچارے الٹے لٹکے ہوئے اصغر کو اپنی شیشم کی لکڑی سے ٹھونسہ دیتے ہوئے دلاور نے کہا "کہئے اصغر صاحب۔ مزاج اقدس۔ اجی آپ تو سلطانہ کو دلاور کے پھندے سے نکال کر محمود سیٹھ سے انعام حاصل کیجئے" قہقہہ لگا کر وہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "مگر ذرا جناب اس دوزخ کی چنگاری سے بھی تو پوچھ لیجئے۔ ہاہاہا۔" "ہا"

پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھکر کہنے لگا "چلو اور اس کمبخت کو" اپنی لکڑی سے غریب اصغر کو پھر ٹھونسہ دیتے ہوئے اس نے کہا "اس جنگل بیابان میں جل کر خاک ہو جانے کے لیے چھوڑ دو"

یہ کہکر اس نے سلطانہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اور اصغر کو اس کے حال پر چھوڑ کر لمبی لمبی ڈگیں مارتا ہوا آگے بڑھا۔ پیچھے پیچھے اس کے ساتھی

قہقہے لگاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

دور سے پلٹ کر دلاور نے اصغر کی طرف دیکھا اور ٹھٹھا مار کر چلاتے ہوئے کہا: "خدا حافظ مسٹر اصغر خدا حافظ"

"میں تو جل کر خاک ہو جاؤں گا" اصغر نے غصے سے چلا کر کہا۔ "مگر یاد رکھ دلاور، اس کا پھل تجھے اچھا نہ ملے گا"

دلاور نے جواب میں ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور گنجان جنگل میں مع سلطانہ اور اپنے ساتھیوں کے غائب ہو گیا۔

باب ۱۶

"تیری محبت میں جان دیدی"

پھونس کی چند جھونپڑیوں کے سامنے آدم خور حبشی گھیرا بنائے ہوئے ناچنے گانے کودنے اُچھلنے غرض اسی طرح خوشیاں منانے میں مشغول تھے۔ سامنے پتھروں پر رکھے ہوئے ایک بڑے کڑھاؤ میں تیل کڑکڑا رہا تھا۔ اور قریب ہی دو حبشیوں کے سیاہ مضبوط بازوؤں میں اختر جکڑا ہوا کھڑا تھا۔ وہ حسرت سے آسمان کی طرف نظر اُٹھائے پروردگار عالم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔

یکایک اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بوڑھی ماں کھڑی ہوئی رو رہی

تھی"۔ بیٹے، کیا اسی دن کیلئے میں نے تجھے فاقے کر کر کے۔ سلائیاں سی سی کر مصیبتیں جھیل جھیل کر پالا تھا کہ آج تو اس منحوس کڑاہو میں کباب ہو کر ان کمبخت وحشیوں کے پیٹ میں لقمہ بن کر اُتر جائے۔ بیٹے۔ پیارے بیٹے۔ مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ تیری بوڑھی ماں تیرے بعد کیسے جئے گی۔ بیٹے میرے بیٹے۔ او میرے اختر اپنی بوڑھی ماں پر رحم کھا۔ اللہ میں کیا کروں۔ "... آہ ... او خدا مجھے موت دیدے۔ اُس نے دیوانوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر چلاتے ہوئے کہا۔ او وحشیو، میرے لخت جگر کو چھوڑ دو۔ ہاں۔ ہاں۔ میں تیار ہوں۔ آؤ آؤ نہ مجھے ... مجھے اس کڑکڑاتے تیل میں ڈال دو"

ایک دم سے اُس کی بوڑھی ماں اس کی نظروں سے غائب ہوگئی۔ اختر کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ ٹپ ٹپ دو آنسو اس کی خوبصورت آنکھوں سے گرے اور اُس کے دلفریب رخساروں پر سے ہوتے ہوئے مٹی میں مل گئے۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بادصبا اُس کی پیشانی کو چوم رہی تھی۔ اسنے بادصبا کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے نسیم سحری مجھ سے اٹھکیلیاں نہ کر۔ جا۔ میرے معشوق کو پیغام دے اس سے کہنا۔ اختر نے تیری محبت میں جان دیدی۔ اگرچہ اُسے یہ سنکر حیرت ہوگی۔ کیونکہ اُسے آج تک میرے عشق کی خبر نہیں۔ تاہم اے پیاری نسیم تو اُسے کسی نہ کسی طرح یقین دلا دینا اور یہی کہنا۔ اختر تیرا سچا ... آہ، عاشق تھا۔ مگر ٹھہر۔ ممکن ہے محبت میں میرے مرنے کا حال سُنکر اسکو کوئی صدمہ پہنچے۔ اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہو جائے۔ اسلئے دیکھ

اے بادِ صبا دیکھ۔ ایک لفظ بھی میری پریشانیوں کا اپنی زبان پر نہ لانا۔ ہاں صرف اتنا کہنا۔ اختر تیرا سچا عاشق تھا۔

باب ۱۷

"میں امّاں کو بلاتی ہوں"

یوسف اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا بندوقیں وغیرہ نوکر کو موٹر میں رکھنے کے واسطے دے رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"کون ہے"؟ اس نے پوچھا۔

ایک شیریں آواز "میں آسکتی ہوں"؟

یوسف "ہاں ہاں آجاؤ"

دروازہ کھلا اور اس کی بڑی بہن زہرہ داخل ہوئی۔ یہ اسوقت گلابی رنگ کی ساری میں بھلی معلوم ہو رہی معلوم ہو رہی تھی۔

زہرہ "کیسے ہو یوسف"؟

یوسف (گھبرا کر) اچھا ہوں۔ کیوں؟"

زہرہ (مسکرا کر) رات کہاں تھے"؟

یوسف (بات بناتے ہوئے) میں ذرا " " " اپنے ایک دوست کے یہاں تھا۔ یونہی۔ دعوت وغیرہ تھی۔ (زمین کو دیکھتے ہوئے) ذرا دیر ہو گئی تو

اُن لوگوں نے روک لیا کہ اب صبح ناشتہ کر کے چلے جانا"

زہرہ۔ (گردن ہلا کر) ہوں ...... مجھے سب خبر ہے حضرت ... دیکھو یوسف۔ تم اپنے پاؤں پر آپ ہی کلہاڑی مار رہے ہو۔ یہ کمبخت رنڈیاں کسی کی نہیں ہوا کرتیں۔ تو تمہاری کیا ہوں گی۔ تم میں کوئی سرخاب کا پر تو لگا نہیں ہے اسی وجہ سے سلطانہ تم سے نفرت کرتی تھی۔

یوسف:۔ (آنکھیں پھاڑ کر) تھی کے کیا معنی۔؟ کیا وہ مر گئی"

زہرہ:۔ تمہاری بلا سے"

یوسف:۔ آخر ہوا کیا"؟

زہرہ:۔ ہوا کیا۔ رات سے غائب ہے۔ سنا ہے کسی سہیلی کی کار میں کالج سے گھر آ رہی تھی کہ کسی بدمعاش نے اسپر حملہ کیا۔ اور اُسے اپنی موٹر میں کہیں لے اُڑا۔ کہاں تک صحیح ہے واللہ عالم۔ (جمائی لیکر) بھئی میرا خیال تو یہ ہے کہ سلطانہ تھی کالج کی پڑھنے والی فیشن کی دلدادہ۔ وہ بھلا تم جیسے جاہل کو کیوں پسند کرتی۔ خالہ اماں سے اسی معاملہ میں کچھ جھگڑا ہوا ہوگا۔ کالج میں لڑکے بہت سے پڑھتے ہیں۔ کسی سے ہو گئی ہو گی محبت۔ بس چل دیں اس کے ساتھ۔ خیر۔ لیکن سنا ہے بیچارے خالو میاں اور خالہ اماں کی بُری حالت ہے۔ رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہے ہیں دونوں۔ میں ابھی وہیں جا رہی ہوں"

یوسف:۔ چولھے میں جائے۔ (منہ بنا کر) میں ہی کب اس سے شادی کرنا پسند کرتا ہوں۔ یہ تو سب آپ لوگوں کی ضد تھی"

زہرہ:۔ اچھا یہ تو گئے اب کہاں کی روانگی ہے۔ یہ بستر وغیرہ ......"

یوسف۔ (آنکھیں ملتے ہوئے) شکار کو جا رہا ہوں۔ (نوکر سے) ارے بھئی سب سامان رکھ دیا"

نوکر" جی ہاں حضور۔ بس یہ بستر رہ گیا ہے"

الغرض بستر بھی رکھ دیا گیا اور مسٹر یوسف اپنی کار میں بیٹھ کر بازار سے پانچسو روپیے کی بھاری ساڑھی خریدتے ہوئے حسن آرا کے گھر پہونچے اور ساڑھی پیش کرتے ہوئے بولے" یہ لیجئے حضور آپ کی چیز"

پھر کیا تھا یوسف کے گلے میں حسن آرا کی گوری گوری باہیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ لہک کر گا رہی تھی۔

دم لبوں پر تھا دل زار کے گھبرانے سے
آگئی جان میں جان آپ کے آجانے سے

تیرا کوچہ نہ چھٹے گا تیرے دیوانے سے
اسکو کعبے سے نہ مطلب ہے نہ بتخانے سے

جہاں ملب دیکھ کے سینے سے لگایا اُسنے
گھٹ گئی شرم مرے شوق کے بڑھ جانے سے

رونق عشق بڑھا دیتی ہے بیتابیٔ دل
حسن کی شان فزوں ہوتی ہے شرمانے سے

یوسف" اچھا اب چلتی ہو یا نہیں"

حسن آرا" کہاں"؟

یوسف" بڑی جلدی بھول گئیں۔ شکار میں چل رہی تھیں نا"

حسن آرا" (یوسف کو پیار کرتے ہوئے) جانی اب تمہیں ہو آؤ۔ پھر کبھی چلی چلوں گی تمہارے ساتھ شکار میں۔ بات یہ ہے کہ مجھے دعوت میں جانا ہے۔ ادھر تم گھر گئے ادھر مشتری کے یہاں سے اذن آیا"

یوسف" واہ یہ اچھی رہی۔ خود ہی تم نے ضد کی تھی اور خود ہی پھسل گئیں۔

تمہاری ضد ہے تو میں جا رہا تھا۔ میں کچھ نہیں جانتا اب تو تمہیں چلنا پڑے گا۔ دعوت کی ایسی تیسی۔"

حسن آرا (یوسف کے گلے پر اپنا گال رکھکر دباتے ہوئے) "من جاؤ پیارے۔ آپس داری کا معاملہ ہے۔ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ تم ہو آؤ۔ ہاں ... ... بڑے اچھے ہو تم تو۔"

یوسف "تو پھر میں بھی نہیں جاتا۔ میں تو صرف تمہیں شکار کھلانے لے جا رہا تھا"

حسن آرا (اٹھلا کر) "تمہیں میری جان کی قسم۔ میرا مردہ دیکھو جو شکار کو اسی وقت نہ جاؤ۔ اور ہاں سنو۔ ... ... اماں کو بھی لیتے جاؤ۔ ان بیچاری نے آجتک جنگل ہی نہیں دیکھا۔"

یوسف۔ (ہنسکر) "یہ ایک ہی رہی۔ اماں کو لیتے جاؤ۔ اماں کو لے جا کر کیا کروں گا"؟

حسن آرا "نہیں میری خاطر سے پیارے۔ دیکھو میں تم کو اپنی جان کی قسم دے چکی ہوں۔ ٹھہرو۔ میں اماں کو بلاتی ہوں۔"

الغرض مسٹر یوسف کو اپنی چہیتی حسن آرا کی خاطر شکار میں جانا پڑا اور ساتھ ہی اس کی ماں کو بھی لے جانا پڑا۔

باب ۱۸

"وہ چلا گئی۔ میری آبرو۔ میری عزت"

سیکڑوں دلفریب رنگ کے ننھے ننھے پھولوں سے بھری ہوئی وادی

ہیں ہرے مخمل جیسے فرش پر دلاور سلطانہ کو گود میں لئے بیٹھا تھا اور وہ بیچاری ہاتھ پیر مار کر اس کی گود سے اُترنے کی فضول کوشش کر رہی تھی۔ آس پاس وہ پانچوں بدمعاش بیٹھے ان دونوں کا تماشا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

دلاور کہہ رہا تھا۔ لڑکی دیکھ۔ سیدھی طرح نہ مانے گی تو پھر۔ تو پھر" آنکھیں نکالتے ہوئے اُس نے کہا:" پھر جبر کرنا پڑے گا"

"مجھے چھوڑ دو" (روتے ہوئے سلطانہ بولی۔) مجھے جانے دو۔ خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرو"

" گھبراتی کیوں ہے" دلاور نے آنکھ مار کر اپنے دوستوں کو ٹل جانے کا اشارہ کیا" گھبراتی کیوں ہے۔ چھوڑ دوں گا۔ جانے دوں گا۔ ذرا ٹھہر کے"

" او ظالم" سلطانہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا" جان لے لے پر آبرو نہ لے" (اب وہ پانچوں نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔)

"جان لیکر کیا کروں گا" ہنسکر دلاور بولا۔ اچھا لاؤ حسن کا صدقہ ایک میٹھا گرم گرم۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"راکٹ وہ بدمعاش کمینے" سلطانہ نے اپنی مٹھی اس زور سے اُس کے بڑے بڑے دانتوں پر ماری کہ مسٹر دلاور کا ایک بڑا بدنما دانت شہید ہو گیا اور سلطانہ کے نازک ہاتھ سے خون بہ نکلا۔

اُف کر کے دلاور نے اپنا منھ پکڑ لیا اور سلطانہ نے موقع پا کر بھاگنا چاہا۔ لیکن فوراً دلاور نے اپنے مضبوط بازوؤں کی آہنی گرفت میں لیکر اس کے منھ پہ رکھ دیا۔

وہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی - اے خدا رحم ۔۔۔۔۔۔ اور رحم

وہ چلّائی "میری عزت" ۔۔۔ "میری عزت"

"بس خاموش" دلاور نے ڈانٹ کر کہا "کیسی عزت اور کہاں کی عزت" وہ اپنا سینہ پھلا کر بولا - اگر خدا بھی آجائے تو اسوقت تو نہیں چھوٹ سکتی" "او خدا" سلطانہ زور سے چلائی - دلاور نے زور کا قہقہہ لگایا - روئی کے گالے چپ رہ - اُف کتنا ملائم اور چکنا ہے تیرا جسم - یہ تیری سڈول رانیں - یہ اُبھرا ہوا سینہ - مست جوانی - ظالم ذرا تو سیدھی رہ"

"او خدا" وہ بے بسی کے عالم میں چلائی -

"بس" دلاور سلطانہ کے ہاتھ پیر اپنے قبضے میں کرتے ہوئے بولا - بس - "خاموش" رحم اے پروردگار - میری آبرو - سلطانہ بری طرح کانپ رہی تھی - قریب تھا کہ اس کی موتی جیسی آب اُتر جائے - کہ یکایک دلاور نے ایک چیخ ماری اور اب وہ زمین پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا - ایک تیر اس کے بازو کے آر پار تھا - سلطانہ نے آسمان کی طرف دیکھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور اسکی آنکھوں میں دو تازے آنسو تھے - ابھی وہ اپنے خالق کا شکر ادا کر رہی تھی کہ چونک پڑی - کیا دیکھتی ہے کہ چار کوئلے جیسے کالے برہنہ آدمی کمانیں ہاتھ میں لیئے - عجیب قسم کے ڈھول گردنوں میں ڈالے اس کی طرف دوڑتے چلے آرہے ہیں - اس کا دل بانسو اُچھلنے لگا - وہ چاروں آدم خور حبشی اپنے شکار پر جھک پڑے - تیر دلاور کے بازو سے نکال کر اس کو سر سے اونچا اچھالا پھر اسے زمین پر پٹک کر اس کے آس پاس ناچنے لگے - دلاور نیم بیہوش سا تھا - ان وحشیوں نے اپنے اس شکار کو

دیکھ دیکھکر اس قسم کی حرکتیں کرنا شروع کیں گویا وہ اُسے بھون بھون کر کھا رہے تھے۔
سلطانہ یہ دیکھکر سمجھ گئی کہ یہ لوگ آدم خور ہیں۔ وہ ڈر کر بھاگی مگر پکڑی گئی۔
اور اب یہ چاروں آدم خور حبشی اپنے دونوں شکاروں کو سر سے اونچا اُچھالتے
ہوئے خوش خوش کودتے پھاندتے گاتے بجاتے اپنے گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔

باب ۱۹

"آہ"

بڑ کے درخت کے نیچے آگ کے خوفناک شعلے اُٹھ اُٹھ کر اصغر کے منہ کو جھلس
رہے تھے اور بیچارہ اصغر اُلٹا لٹکا ہوا تکلیف سے چلا رہا تھا۔ دلاور کے قہقہے
ابتک اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اور وہ اپنے دل میں پیچ و تاب
کھا رہا تھا۔ کاش وہ اسوقت اس بے بسی کے عالم میں نہ ہوتا۔ تو دلاور کو اسکا
مزہ اچھی طرح چکھاتا۔ مگر افسوس چند لمحوں کے بعد وہ دوسری دنیا میں ہو گا۔
وہ خوشی سے جانے کو تیار تھا مگر دلاور سے بدلہ لینے کے بعد۔ میرے چھوٹے چھوٹے
بچے ہیں اُنھیں کون پالے گا؟ یہ خیال آتے ہی وہ رو دیا۔ "نہیں"۔۔۔ وہ تو بے
وہ تو بے پال لینے والا ہے"

آگ کی ہر لپیٹ کے ساتھ "آہ" اسکے منہ سے نکل رہی تھی۔ جوں جوں
شعلے بڑھتے جا رہے تھے ووں ووں اصغر کو موت قریب آتی دکھائی دے رہی تھی۔

باب ۲۰

"آگ"

گنجان جنگل کی سرسبز گھاس پہ دور ایک بیل گاڑی چرچوں چرچوں کرتی چلی جارہی تھی۔ یوسف ہاتھ میں بندوق لئے حسن آرا کی ماں کو دچو گاڑی کے دھچکوں سے پریشان ہورہی تھی، سامنے والے درختوں کے نام تہا رہا تھا گاڑی بان بیٹھا بار بار غریب بیلوں کی پیٹھ میں "آر" چبا چبا کر" چل بیٹا چل چل چل" کی رٹ لگا رہا تھا۔ یکایک نرائن (گاڑی بان) کے منہ سے نکلا "آگ"

"ہیں" چونک کر یوسف نے کہا "کہاں کہاں"؟

"حجور وہ ... ... سامنے ناک کی سیدھ میں" نرائن نے آر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ بڑکے پیڑ میں"

"ہاں ہاں" یوسف دیکھتے ہوئے بولا "مگر یہ آواز کیسی؟ سُنتا ہے"

"ہاں حجور" نرائن نے غور سے سننے کی کوشش کرتے ہوئے بھاڑ سا منہ کھولدیا "کوئی ہائے ہائے کرے ہے"

"ذرا جلدی بڑھا" یوسف نے نرائن کو ٹھونسہ دیتے ہوئے کہا "دیکھیں تو سہی"۔

"ہو سرکار" نرائن کے منہ سے نکلا اور داہنے بیل کی پیٹھ میں آر چبھا کر "چل" کہتے ہوئے اُس نے بائیں بیل کے کوٹھے پہ لکڑی جمائی۔ بیل بیچارے

اپنی پوری رفتار سے بھاگنے لگے۔

الغرض گاڑی برڑ کے درخت کے قریب پہونچی۔ یوسف کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے ایک شخص کو اُلٹا لٹکے ہوئے آگ کی سُرخ سُرخ لپٹوں میں تڑپتے دیکھا۔ اصغر کی آنکھیں بند تھیں درد بھری "آہ" اُس کے منھ سے نکل رہی تھی۔ نرائن سے نہ رہا گیا۔ گاڑی سے کود کر چشم زدن میں وہ برڑ کے درخت پر چڑھا ہوا رسی پکڑ کر اصغر کو اوپر کھینچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اصغر جس کا سارا منھ جھلسا ہوا تھا چلتی ہوئی بیل گاڑی میں پڑا کانپتے ہوئے یوسف سے کہہ رہا تھا "آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ آپنے میری جان ......"

یہ کہکر اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور اب وہ بیہوش تھا۔

اس سے پہلے یوسف اس کی آواز کبھی سُن چکا تھا وہ سوچ رہا تھا۔

"یہ اُس بدمعاش رفیق کی ٹولی کا تو نہیں ہے وہی رفیق جس نے ایک دفعہ دو سو روپئے لیکر شریف گھرانے کی ایک کنواری لڑکی مجھے لاکے دی تھی۔"

باب ۲۱

"بس بس خدا کیلئے"

اب وقت آچکا تھا کہ اختر کھولتے ہوئے کڑکڑاتے تیل میں ڈالدیا جائے برہنہ جنتی عورتیں ناز و انداز کے ساتھ اختر پر پھول برسا رہی تھیں۔ یہ اُن کے یہاں

کی رسم تھی۔ اختر سہمکا نے آنکھیں بند کیے خدا سے لو لگائے کھڑا تھا کہ یکایک حبشیوں
کے سردار کے بڑے لڑکے نے اُسے سر سے اونچا اُٹھا لیا۔ اور سارا جنگل تالیوں
سے گونج اُٹھا۔ اب سردار کا بیٹا اختر کو سر سے اونچا اُٹھائے ہوئے کڑھاؤ کیطرف
بڑھا۔ پھر کڑھاؤ کے قریب پہونچکر اپنی زبان میں کچھ پڑھا اور اب اختر کو اُچھال کر
چاہتا تھا کہ کڑکڑاتے تیل میں پھینکدے کہ دفعتاً اُس کے باپ کی آواز اُس کے کان
میں آئی۔ شاید اُس آواز میں منادی تھی جبھی تو سردار کا لڑکا فوراً ٹھہر گیا پلٹکر
اُس نے دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا باپ ہاتھ میں کمان لیے گلے میں ڈھول
ڈالے پیٹھ پر ایک خوبصورت لڑکی کو لادے کھڑا ہے۔ اور اُس کے پیچھے تین ساتھی ایک
موٹے تازے بدصورت انسان کو سر سے اونچا اُچھال رہے ہیں۔ سردار نے اپنے بیٹے
اپنی زبان میں کچھ کہا جس کا مطلب شاید یہ تھا کہ جس کو تو اُٹھائے ہوئے ہے۔ وہ
دُبلا ہے۔ اس موٹے تازے شخص کا گوشت زیادہ لذیذ ہوگا۔ اس کو تیل میں ڈال"۔
کیونکہ سردار کے لڑکے نے فوراً ہی اختر کو زمین پر پٹک دیا۔ اور اُس کی جگہ مسٹر ڈلاور
کو برہنہ کر کے سر سے اونچا اُٹھا لیا۔

سلطانہ نے ڈلاور کے کوٹ میں (جو زمین پر اس کے پیر کے قریب پڑا تھا) ہاتھ
ڈالا تاکہ اسکا پستول نکال کر ان آدم خوروں سے پیچھا چھڑا سکے۔ مگر پستول کے بجائے
اُس کے ہاتھ میں سچے موتیوں کا ہار تھا۔ جو اس کی سالگرہ پر اسے سیٹھ محمود نے دیا تھا۔
سلطانہ نے اپنے دل میں کہا۔ "تو یہ کارستانی بھی ان ہی کی تھی"؛ الغرض ہار اُسنے
اپنے سینے میں چھپا لیا۔

اتنے میں حبشیوں کی ایک اور ٹولی آتی دکھائی دی۔ یہ بھی ایک موٹے

تازے آدمی کو اچھال اچھال کر نعرے لگاتے چلے آ رہے تھے۔ یہ شخص دلاور کے پانچ بدمعاش دوستوں میں سے ایک تھا جس کو ان حبشیوں نے جنگل میں کہیں پکڑ لیا تھا۔

کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ یکایک سلطانہ کی نظر اس دبلے پتلے آدمی پر پڑی جس کو پہلے کڑھاؤ میں ڈالنے کے لئے اُٹھا لیا گیا تھا۔

"ہیں اختر" اس کے منہ سے نکلا۔

اتنا وہ کہنے پائی تھی کہ ایک کریہہ المنظر حبشی نے اسے گود میں اُٹھا لیا اور قریب کی ایک جھونپڑی میں لیجا کر بند کر دیا۔ دو منٹ بعد جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور وہی حبشی اختر کو اُٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔ بیہوش اختر کو زمین پر پٹک کر اور سلطانہ کی طرف دیکھکر اُس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ یکایک جھونپڑی کے باہر حبشی زور سے چلائے جیسے اُن کا مرغوب ترین کھانا پک کر تیار ہو گیا ہو۔

جھونپڑی والا حبشی بھی خوشی سے اُچھل پڑا اور جلدی سے جھونپڑی سے نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

"یہ اختر یہاں کیسے آ پہونچے" سلطانہ سوچ رہی تھی "یہ جنگل میں کیا لینے گئے تھے جو حبشیوں نے انھیں بھی پکڑ لیا۔ بہرحال اختر کی موجودگی سے سلطانہ کی کچھ ڈھارس سی بندھ گئی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اختر بیچارہ خود ہی مصیبت میں پھنسا ہے وہ اس کی کیا مدد کر سکے گا۔

حبشی نے اختر کو زمین پر اس بری طرح پھینکا تھا کہ اُس کا ایک ہاتھ

کمر کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔

"بیچارہ اختر" سلطانہ کی زبان سے نکلا اور وہ اُس کے قریب بیٹھکر کمر کے نیچے اختر کا دبا ہوا ہاتھ نکالنے لگی۔

اختر نے آنکھیں ہٹپٹائیں۔ "۔۔۔۔۔۔۔ میں کہاں ہوں۔ تم کون ہو"؟

سلطانہ "اختر صاحب آپ مجھے نہیں پہچانتے"؟

اختر۔ "(آنکھیں پھاڑ کر) کون ؟ تم۔۔۔ تم ۔۔۔"

سلطانہ "ہاں۔ میں۔ میں ہوں آپ کی کلاس فیلو سلطانہ"

اختر کا کچھ دماغ ٹھکانے ہوا لیکن اپنی محبوبہ کو اپنے قریب دیکھکر کچھ عجیب کیفیت سی اسپر طاری تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھکر سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور سلطانہ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اختر پاگل ہو گیا ہو۔ ایک منٹ تک وہ خاموش رہا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ بول ہی نہ سکا۔ پھر اس کے خوبصورت رخساروں پر دو آنسو بہ نکلے۔

"اچھی تو ہیں آپ" اختر کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

سلطانہ۔ "خدا کا شکر ہے لیکن آپ یہاں کہاں"؟

اختر کے دل نے کہا۔ "آہ" "ابتک اسکو یہ بھی پتہ نہیں کہ اختر کے یہاں ہونے کا سبب کیا ہے"۔ وہ نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا۔

سلطانہ "ہاں تو آپ یہاں کیسے آئے اختر صاحب"؟

اختر "(مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) جیسے آپ یہاں تشریف لے آئیں"۔

سلطانہ "(آنسو پونچھکر) مجھے تو یہ کمبخت وحشی اُٹھا لائے"۔

اختر "مجھے بھی یہی وحشی اُٹھا لائے"۔

سلطانہ:۔ "کہاں سے"؟

اختر:۔ "کہیں سمندر کے قریب سے۔ اور آپ کو"؟

سلطانہ:۔ "مجھے تو ان کمبختوں نے ایک بیابان جنگل میں پکڑ لیا تھا لیکن آپ اس ویرانے میں سمندر کے کنارے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"؟

اختر:۔ "اور آپ بیابان جنگل میں کیسی"؟

سلطانہ (گردن جھکا کر زمین کو دیکھتے ہوئے) "مجھے تو وہ نقاب پوش اُٹھا لایا تھا بدمنی کی کار سے"

اختر:۔ "اور میں اُس نقاب پوش کا پیچھا کر رہا تھا"

سلطانہ "آپ پیچھا کر رہے تھے۔ کس طرح"؟

اختر:۔ "موٹر سے"

سلطانہ (کچھ سوچکر) "پھر کیا ہوا"؟

(چونکہ اسوقت ڈاکو سلطانہ کو بیہوشی دے چکا تھا اسلیئے اس غریب لڑکی کو یہ تک نہیں معلوم تھا کہ کسی نے اس کا پیچھا بھی کیا تھا)

الغرض اختر نے اسے بتایا کہ کس طرح اُس کی موٹر پانی میں گر گئی اور کیسے خدا نے اُسے بچا لیا۔ سلطانہ کے پوچھنے پر اختر نے یہ بھی بتا دیا کہ کس طرح ان بدمعاشوں کی اسکیم بھٹیٹر میں بنی تھی اور چونکہ اس کو پورا یقین نہ تھا کہ وہ واقعی ایسا کر گزریں گے اس لیئے اُس نے سلطانہ کو بلا وجہ خبردار کر کے پریشانی میں ڈالنا نہ چاہا۔ لیکن احتیاطاً اپنے دوست افضل حسین سے پستول لیکر رکھ لیا تھا ڈرامہ ختم ہونے پر جب وہ گھر کی طرف جا رہا تھا تو اُس نے ان بھٹیٹر والے بدمعاشوں

کو ایک موٹر میں جاتے دیکھا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "آج دیکھنا دلآور کی دلاوری" اختر چونک پڑا اور ٹیکسی کرکے اُدھر روانہ ہو گیا۔ جدھر ان بدمعاشوں کی موٹر گئی تھی۔

اسکے بعد سلطانہ نے بھی اپنا سارا قصہ سنایا۔ اختر غور سے سُن رہا تھا دلآور پر اس کو بے انتہا غصہ چلا آرہا تھا اگر اسوقت اس کے سامنے دلآور ہوتا تو نہ جانے یہ کیا کر ڈالتا۔ مگر دلآور اب کہاں ۔۔۔۔۔ ؟"

دفعتاً سلطانہ نے بڑا ٹیڑھا سوال کیا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں اختر صاحب۔ آپ نے اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالی میرے لیئے یوں ؟"

اختر کو ایک دھکا سا لگا۔ اس سوال کے جواب میں اُس کی آنکھیں آنسوؤں کا مینہ برسانے لگیں۔ بڑی مشکل سے وہ اتنا کہہ سکا۔

"یوں ہی۔ جی چاہا تھا بس"

سلطانہ (آنکھیں پھاڑ کر) "آپ رونے لگے۔ یہ کیوں" ؟

اختر کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے وہ بولا "کچھ نہیں"

سلطانہ "کچھ تو"

اختر "کچھ بھی نہیں"

سلطانہ (سرد آہ بھر کر) یہ سب تکلیفیں آپ کو میری وجہ سے پہونچی ہیں"

اختر "آپکی وجہ سے ۔؟ نہیں۔ میری قسمت ہی میں ازل سے تکلیفیں ہیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بچپنے میں والد کا انتقال ہو گیا مصیبتیں جھیل جھیل کر بیوہ ماں نے پالا۔ کالج میں داخل ہوا تھا کہ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔
کاش کہ میں کالج میں داخل ہی نہ ہوتا۔ (وہ کچھ سوچنے لگا)
سلطانہ:۔ کالج میں داخل ہونے سے کیا ہوا۔ شاید آپ کا مطلب یہ ہے کہ نہ کالج میں داخل ہوتے اور نہ آج اس مصیبت میں پھنستے۔"
اختر:۔ (جھنجھلا کر) اُف ۔۔۔ شاید آپ سمجھتی ہیں۔ میں مرنے سے ڈرتا ہوں"
سلطانہ (مسکرا کر) تو پھر آخر کیا بات ہے۔ کچھ تو کہئے۔"
اختر:۔ کیا کہوں۔ مجھ سے نہیں کہا جاتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن ڈراسکی سانس پھول گئی۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔)
سلطانہ (اختر کو گھورتے ہوئے) آپ کو کہنا پڑے گا۔"
اختر:۔ (رکتے ہوئے) مجھے ایک ۔۔۔ ۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔"
سلطانہ:۔ ارے، ارے، کہئیے۔"
اختر:۔ کیا کہوں۔ کوئی بات بھی ہو۔"
سلطانہ:۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ اختر صاحب، آپ مجھے اپنا رازدار نہیں بنانا چاہتے تو جانے دیجئے۔ (بھولے پن سے) سنئے اب یہ حبشی ہم لوگوں کو کھا جائیں گے کیا۔" ؟
اختر نے سلطانہ کو غور سے دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے خبر نہیں کہاں پہونچ گیا۔
سلطانہ:۔ سچ بتلائیے اختر صاحب۔ یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ دیکھئے تو آپ مجھے

اپنا رازدار بنانا نہیں چاہتے۔ لیکن میں بے غیرت بنکر پھر سے پوچھ رہی ہوں۔"

اختر: "آپ کو نہیں پتہ؟"

سلطانہ: "کاہے کا؟"

اختر: "اچھا سنئے، میں آپ کو اپنا رازدار بناتا ہوں۔"

سلطانہ (مسکرا کر) "شکریہ۔"

اختر: (ہمت کر کے) "میں کچھ ... دیوانہ سا ہوتا جا رہا ہوں۔"

سلطانہ (ہنس کر) "کہے جایئے۔"

اختر: "آپ تو مجھ پر ہنستی ہیں۔ جانے دیجیئے۔"

سلطانہ: "نہیں نہیں۔ کہیئے۔ اب نہیں ہنسوں گی۔"

اختر: "میں کچھ سوچتا رہتا ہوں ہر وقت۔"

سلطانہ: "کیا؟"

اختر: "میرے دل میں ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ آہ۔"

سلطانہ: "یہ کیوں؟"

اختر: "وہ میرے دل میں سما چکی ہے۔"

سلطانہ: "کون؟"

اختر: "وہ میری روح کی گہرائیوں میں اتر چکی ہے۔"

سلطانہ: "کون ہے وہ؟"

اختر: "میں اُسے چاہتا ہوں۔ اُس سے محبت کرتا ہوں لیکن ... ... "

سلطانہ: "آپ کس کو چاہتے ہیں۔ آپ کس سے ... ... "

اختر "لیکن ... لیکن وہ یہ بھی نہیں جانتی۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ میرے یہاں ہونے کا سبب کیا ہے"؟

سلطانہ کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے وہ دل میں کہہ رہی تھی "اختر کو مجھ سے محبت ہے"

اختر "وہ نہیں جانتی۔ وہ کچھ نہیں جانتی۔ وہ میرا مذاق اُڑاتی ہے۔ وہ مجھے دیوانہ سمجھتی ہے۔ وہ پتھر ہے۔ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے اسکا دل"

سلطانہ "بس بس۔ خدا کے لیے"

(اُس نے اختر کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر زور سے دبایا) اور روتے ہوئے اختر کی طرف دیکھکر کہا "اختر"

اختر کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹوں میں جنبش تھی۔ ہاتھ پیروں میں لرزہ تھا۔ یکایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ دوڑ گئی۔ کانپتی ہوئی آواز اُس کے منھ سے نکلی "سلطانہ"

باب ۲۲

بنجارن مجبور ہو گئی!

شام کا وقت تھا۔ آفتاب دن بھر کی کڑی منزل طے کرنے کے بعد دریا کے آئینہ پر پارہ سا بکھیرتا ہوا مغرب کے پہاڑوں میں نئی دلہن کی طرح منھ چھپا رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی

ہوا چل رہی تھی ۔ درختوں پر چڑیاں چوں چوں چوں چوں کر کے بسیرہ لینے کی فکر میں تھیں ۔ دریا کے کنارے ایک خیمہ لگا ہوا تھا ۔ خیمے کے باہر یوسف کھڑا ہوا ایک ہرن کو جس کو ابھی ابھی شکار کر کے لایا تھا ۔ گاڑی بان سے اُدھڑوا رہا تھا اور حسن آرا کی ماں خیمے کے دروازے پر کھڑی ہوئی ہرنی کے اُدھڑنے کا تماشہ دیکھ رہی تھی ۔

خیمے کے اندر اصغر چارپائی پر پڑا تھا ۔ کراہتے کراہتے ابھی ابھی اس کی آنکھ لگ گئی تھی ۔ ابھی تک یوسف سے اس کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی ۔ کیونکہ اصغر کو آگ سے بچانے کے بعد یوسف اسے خیمے میں نیم بیہوش چھوڑ کر پھر فوراً شکار کو چلا گیا تھا اور دن بھر کے بعد ابھی ابھی واپس آیا تھا ۔ اصغر نے سوچا تھا کہ جب یوسف شکار سے آ جائے گا تو سلطانہ کا قصہ اس سے بیان کرے گا ۔ وہ جانتا تھا کہ یوسف سلطانہ کا لون ہے ۔ سنتے ہی آگ بگولہ ہو جائے گا اور دلاور کو ایسی سزا دلوائے گا کہ وہ چند ابھی ٹھیک ہو جائیں گے ۔ یہی سوچتے سوچتے وہ سو گیا تھا ۔ اسے کیا خبر کہ اس کی یہ داستان ان کہی رہ جائے گی ۔

خیمے کے باہر یوسف زور سے بولا ۔ "مجھے تو اس کالے ہرن کا افسوس ہے ۔ میں نے لگانا اُسی کے چاہا تھا لیکن کمبخت اس کی آڑ میں ہو گیا ۔ قضا تو اسکی تھی ۔

حُسن آرا کی ماں : "اسوقت حسن آرا ہوتی تو کیسی خوش ہوتی"

یوسف : "وہ بھی عجیب ہیں ۔ کتنا کہا چلو ۔ ۔ ۔ ۔"

حسن آرا کی ماں : "کیا کرتی ۔ مجبوری تھی ۔ آپس داری کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ اور ہمارے یہاں تو خصوصاً بڑے جھگڑے ہوتے ہیں ۔ اسلئے بیچاری مجبور ہو گئی ۔ ورنہ تمھاری بات وہ ٹالتی ۔ تم پر تو اس لونڈیا کی جان جاتی ہے ۔ نہ جانے تم نے کیا دیا ہے

ذرا چین نہیں تمھارے بغیر۔ ایسی پگلی ہوئی ہے تمھارے پیچھے کہ میں کیا کہوں۔ تمھارے سوا اُس کی آنکھوں میں کوئی سماتا نہیں۔ بس ہر وقت تمھارے نام کی تسبیح۔ میں کہتی ہوں اس کو کیا ہو گیا ہے۔ تم نہیں ہوتے تو تمھاری تصویر سے پہروں بیٹھی باتیں کیا کرتی ہے اور ایسی دیوانی حرکتیں کرتی ہے کہ توبہ" " "

کبھی اُسے سینے سے لگائے گی۔ کبھی چومے گی۔ کبھی اس سے باتیں کرے گی۔ عجیب لڑکی ہے بھئی۔ دل آرام تو اس کی یہ حرکتیں دیکھ دیکھ کر ہونٹ کھینچ بجاتی ہے غرض کیا کہوں یوسف میاں۔ تمھارے پیچھے میری اچھی خاصی سیانی لڑکی دیوانی ہوئی جا رہی ہے"

یوسف نے ہرنی کو دیکھتے ہوئے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

باب ۲۳

"دیکھئے ضرور آیئے گا"

حسن آرا مشتری کے یہاں دعوت میں جانے کے بجائے سیٹھ ہزاری لال کی گود میں ٹھاٹھ سے بیٹھی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"پیارے تمھارے سوا مجھے کوئی بھاتا ہی نہیں۔ کتنا خوش کرتے ہو تم مجھے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنی جان تم پر سے نچھاور کر ڈالوں"

یہ کہکر اُس نے ہزاری لال کی پیشانی کو چوم لیا اور بھولے سیٹھ ہزاری لال

سمجھے کہ دنیا میں حسن آرا سے بڑھ کر ان کا چاہنے والا کوئی نہیں۔ بس کیا تھا فوراً ہاتھ جیب میں گیا اور سو روپیے کا نوٹ نکل آیا۔

"لو میری جان" سیٹھ جی اپنی توند ہلا کر بولے "ابھی تو یہ لیلو مٹھائی وٹھائی کھانا۔ رات کو میں آؤں گا تو تمہیں اچھی طرح خوش کر کے جاؤں گا"

"اس کی کیا ضرورت تھی" نوٹ لیتے ہوئے حسن آرا نے مسکرا کر کہا "شکریہ"

"اچھا، اب میں جاتا ہوں" سیٹھ جی نے حسن آرا کو بھینچ کر پیار کرتے ہوئے کہا "ایک ضروری کام ہے۔ رات کو آؤں گا"

"ضرور آئیے گا" طوائف نے سیٹھ ہزاری لال کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا "میں آپکا انتظار کروں گی ایسا نہ ہو کہ ...... دیکھئے ضرور آئیے گا"

الغرض سیٹھ جی رات کو آنے کا پکا وعدہ کر کے خوش خوش طوائف کے کوٹھے سے نیچے اتر گئے۔

باب ۲۴

"ارے تم یہاں کہاں اس وقت"

رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ آدم خور حبشی دس برس کے بعد اپنی مرغوب چیز کے کباب کھا کر خوشیاں مناتے مناتے تاڑی کے نشے میں دُھت گھوڑے بیچ کر سو گئے تھے۔ لکڑی کے پنجرے کے قریب جسمیں اختر اور سلطانہ کو جھونپڑی سے نکالنے کے بعد بند

کردیا گیا تھا) دو قوی الجثہ انسان پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ سلطانہ پنجرے میں اختر کے قریب بیٹھی کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ اختر اپنی معشوقہ کی قربت سے اسقدر خوش تھا کہ اُسے حبشیوں کے کڑھاؤ کا ذرا بھی ڈر نہ تھا۔

"اب کل اپنی باری ہے" آخرکار سلطانہ نے کہا۔ کیا رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے؟"

"سلطانہ" مسکراتے ہوئے اختر بولا "گھبرانے سے کیا فائدہ۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ جو قسمت میں لکھا ہے۔ ہوکے رہے گا۔ موت سے کیا ڈر۔ وہ تو ایک دن آنا ہی ہے۔ دیکھو آج یہ لوگ میرا گوشت کھانے والے تھے لیکن تم جانتی ہو کس کا گوشت کھایا اُنھوں نے۔ یہ کیا تھا۔ آج میری موت نہیں آئی تھی۔ پھر مجھے کون مار سکتا تھا۔ لیکن کل اگر موت کا دن مقرر ہے تو کوئی اُسے نہیں ٹال سکتا۔ ہم کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہیئے۔ جو اسکی خوشی"۔

"اختر اور سلطانہ کے ہاتھ دعا کیلئے اُٹھ گئے"۔

اتنے میں پنجرے کے قریب سونے والے دو حبشیوں میں سے ایک نے ایک خاص قسم کی آواز کے ساتھ کروٹ بدلی۔ اور اپنی کلہاڑی کو جو اس کے پیر کے قریب تھی۔ ایک ایسی لات ماری کہ وہ پنجرے کے بالکل قریب جا پڑی تھی اور اختر نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اُسے اُٹھا لیا۔ اب وہ سلطانہ کی طرف دیکھکر مسکرا رہا تھا۔ پھر نظر اُٹھا کر اُس نے پنجرے کے باہر دیکھا۔ دونوں حبشی پڑے ہوئے زور زور سے خراٹے لے رہے تھے۔ الغرض اُس نے پنجرے کی لکڑی کو کلہاڑی سے آہستہ آہستہ کاٹنا شروع کیا۔ کاٹتے کاٹتے وہ رُک جاتا تھا یہ دیکھنے کیلئے کہ

کہ کلہاڑی کی آواز سے حبشیوں کی نیند پر کوئی اثر تو نہیں پڑتا ہے ۔ لیکن سُرخ سُرخ آنکھوں والے کالے انسان اسقدر تھک گئے تھے کہ اگر ان کے سر پر توپیں بھی چلتیں تو ان کو خبر نہ ہوتی ۔

غرض آدھ گھنٹے بعد پنجرہ کا اتنا حصہ کٹ گیا کہ ایک آدمی بخوبی نکلسکتا تھا ۔ اختر پہلے خود باہر آیا ۔ پھر سلطانہ کو نکالا ۔ اور اب یہ دونوں آہستہ آہستہ دبے پاؤں سونے والے حبشیوں کے قریب سے ہو کر چلے جا رہے تھے کہ ایک حبشی نے زور سے کھانسا سلطانہ کا دل بلیوں اُچھلنے لگا اور وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی ۔ ہاتھ پکڑ کھینچتے ہوئے اختر نے دبی زبان سے کہا ۔ اب چلی بھی آؤ ۔

القصہ تھوڑی دیر بعد جنگل بیابان میں دونوں مصیبت زدہ عاشق و معشوق ہانپتے ہوئے چلے جا رہے تھے ۔ اور نیلے آسمان کے ستارے ان کی رہنمائی کر رہے تھے ۔

یکایک ایک آہ کے ساتھ سلطانہ زمین پر بیٹھ گئی ۔ اور اختر کو ایسا معلوم ہوا گویا ایک تیر اس کے دل کے آر پار ہے ۔ اب وہ جھکا ہوا سلطانہ کے پیر سے کانٹا نکال رہا تھا ۔ کانٹا تو نکل گیا مگر تکلیف سے پاؤں زمین پر نہیں رکھا جاتا تھا اس لیے اختر نے اُسے گود میں اُٹھا لیا ۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا اور اپنی پوری رفتار سے دوڑنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ دو ستارے بول رہے تھے قریب کی جھاڑی میں شیر گرج رہا تھا ۔ سلطانہ شیر کی آواز سے ڈر ڈر کر اختر سے چمٹ چمٹ جاتی تھی ۔ اور اختر اس کو سمجھاتا ہوا دوڑتا چلا جا رہا تھا کہ یکایک ٹھوکر لگی اور وہ مع سلطانہ کے دھڑ سے گر پڑا ۔ اُس کے گھٹنوں

سے خون نکل رہا تھا۔ سلطانہ کا ہاتھ چھل گیا تھا۔ اختر نے جلدی سے اپنے قمیص میں سے ایک چندی پھاڑ کر اپنے لب میں تر کی اور سلطانہ کے چھلے ہوئے ہاتھ پر باندھی۔ دفعتاً دور آدم خوروں کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ اختر نے فوراً ہی سلطانہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اور بھاگنے لگا لیکن حبشیوں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

اختر بیچارہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور چند گز کے فاصلہ پر حبشی اسکے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اختر سمجھ رہا تھا کہ اب ان شیطانوں سے بچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اسے اپنی جان کی مطلق پرواہ نہ تھی ہزار مرتبہ وہ کڑھاؤ کے کڑکڑاتے تیل میں کباب ہو کر ان موذیوں کے پیٹ میں اتر جانے کو تیار تھا بشرطیکہ حبشی اس کی دلربا کو چھوڑ دیں تاکہ وہ آرام سے اپنے گھر میں نرم نرم بچھونے پر میٹھی نیند سو سکے۔ لیکن یہ سب کچھ ناممکن تھا۔

اب وہ دریا کے کنارے دوڑ رہا تھا۔ اور آدم خوروں کی سانس کی آواز اس کے کان میں آ رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر ایک سفید خیمے پر پڑی جو دریا کے کنارے سو قدم کے فاصلہ پر لگا ہوا تھا۔

اب "وہ مدد مدد" چلاتا ہوا خیمے کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا اور قریب تھا کہ حبشی اس کی گردن پر اپنا لوہے جیسا ہاتھ مارے کہ ٹھیک اسوقت ایک شخص خیمے سے نکلا اور اس نے پستول کی نال آسمان کی طرف کر کے فائر کیا تاکہ ظالم ڈر کر مظلوم کو چھوڑ دے۔ اور یہی ہوا پستول کی آواز سنکر حبشی

اُلٹے پیروں بھاگے۔ یوسف نے دو تین فائر اور کیے تاکہ وہ لوگ پھر آنے کا قصد کرنے کی ہمت نکریں۔

اختر نے جو اب تک یوسف کے قریب آ گیا تھا ہانپتے ہوئے یوسف کا شکریہ ادا کیا اور سلطانہ کو گود سے اُتارا۔

موم بتی (جو خیمے میں دروازے کے سامنے تھی) کی روشنی یوسف کے آدھے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"اندر تشریف لیچلیے" یوسف نے گردن ہلا کر کہا۔ اور موم بتی کی روشنی اس کے پورے چہرے پر پڑی۔

سلطانہ "(پہچانتے ہوئے) ارے یوسف بھائی ہیں"

یوسف "(آنکھیں پھاڑ کر) کون"؟

سلطانہ "میں ہوں سلطانہ"

یوسف "سلطانہ"؟ ارے تم یہاں کہاں اسوقت۔ اچھا آؤ۔ اندر آجاؤ"۔

یہ کہکر وہ خیمے میں داخل ہوا۔ اور اُس کے پیچھے سلطانہ اور اختر اندر پہونچے۔

باب ۲۵

"وہ مُرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا"

خیمے کے اندر کونوں میں تین چار پائیاں پڑی تھیں جنمیں سے ایک پر صغرا اور دوسری پر حسن آرا کی ماں پڑی سو رہی تھی۔ دروازے کے سامنے میز پر موم بتی کے پاس وہائٹ ہارس شراب کی دو بوتلیں اور کٹ گلاس کا جام رکھا ہوا تھا۔ میز کے قریب ایک آرام کرسی۔ بینت کی دو کرسیاں اور ایک اسٹول پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف کونے میں دو ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔

خود آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے اور اُن دونوں کو بینت کی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے یوسف نے کہا "ہاں تو سلطانہ یہ قصہ کیا ہے"؟ تم کل رات سے کہاں غائب تھیں؟ اور یہ کون لوگ تمھارا پیچھا کر رہے تھے؟ اور آپ" اختر کی طرف اشارہ کر کے اُس نے پوچھا" آپ کون ہیں"؟

سلطانہ (اختر کی طرف اشارہ کر کے) آپ میرے کلاس فیلو مسٹر اختر ہیں۔ (یوسف کی طرف اشارہ کر کے) اور آپ میرے خالہ زاد بھائی مسٹر یوسف"

اختر نے یوسف کی طرف مسکرا کر ہاتھ بڑھایا لیکن اس طرح ٹال گیا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ اور بیچارے اختر کو کھسیانا ہونا پڑا۔

سلطانہ" انھوں نے مجھکو کافی مدد دی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں کل تک ان آدم خور حبشیوں کے منھ کا نوالہ ہو جاتی جو ابھی ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ قصہ یہ ہوا یوسف بھائی ... ... (اسکے بعد وہ اپنی داستان بیان کرنے لگی)

یوسف غور سے سن رہا تھا اور کن انکھیوں سے اختر کو تاکتا جاتا تھا۔

الغرض جب سلطانہ اپنی تمام کہانی ختم کر چکی تو یوسف نے اپنے نیچے کا ہونٹ چبا کر زمین کو دیکھتے ہوئے کہا "لیکن ... ... کیا میں پوچھ سکتا ہوں اختر صاحب

"آپ کو کیا پڑی تھی جو بلاوجہ جناب نے اپنی جان مصیبت میں ڈالی"؟

اختر (کچھ ڈک کر) آپ جانتے ہیں سلطانہ میری کلاس فیلو ہیں"۔

یوسف (سوکھا سا قہقہہ لگا کر) درست ہے۔ کلاس فیلو کے لیے اتنی بڑی قربانی۔ سچ بتایئے"۔

اختر۔ (ہنسکر) گویا میں جھوٹ بول رہا ہوں"۔

یوسف (ٹھٹھک کر جام میں شراب انڈیلتے ہوئے) مجھے تو بھئی دال میں کچھ کالا کالا نظر آتا ہے۔ (تھوڑی سی پی کر) کیوں سلطانہ"؟

سلطانہ "یوسف بھائی آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں"۔

یوسف (جام دوبارہ بھرتے ہوئے) تو میری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں تمہارے اور آئیں بھی کیسے؟ (معنی خیز نگاہیں سلطانہ پر ڈالتے ہوئے) ساری باتیں تو اختر صاحب سمجھا چکے ہیں تمھیں"۔

سلطانہ "آپ کیا کہہ رہے ہیں"؟

یوسف (تیسرا جام بھر کر) تم دونوں نے مجھے بھولا سمجھ رکھا ہے۔ میں نے ایسے کھیل بہت کھیلے ہیں۔ یہ من گھڑت یہاں نہیں چلے گی۔ کہو تو صاف کہہ دوں (سرخ سرخ آنکھیں نکال کر) بتا دوں اصل قصہ کیا ہے"؟ یہ اختر صاحب تمھارے کون ہیں۔ مجھے معلوم ہے"۔

اختر کے چہرے پر خون تیزی سے دوڑ رہا تھا اور سلطانہ کی سانس کی رفتار تیز تھی۔

یوسف (کھنکار کر) مجھے سب معلوم ہے۔ تم دونوں کل رات سے فرار ہو کس لئے؟

یہ بھی میں جانتا ہوں تاکہ جنگل میں بیفکری سے جوانی کے مزے اُڑا سکو مگر بد قسمتی سے دوسری مصیبتیں۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔"

سلطانہ۔" (چلا کر) بس خاموش"

اختر۔" یوسف صاحب، آپ کو شرم نہیں آتی۔ اپنی بہن کے متعلق ایسے الفاظ"

یوسف" ایسی بے حیا بہن کو کیا نہ کہوں"

اختر" بغیر جانے بوجھے کسی پر الزام رکھدینا اچھا نہیں۔ آپ نے عصمت کی دیوی کو عیب لگایا۔ اور مجھے بدمعاش ٹھہرایا۔

یوسف" بدمعاش نہیں تو آپ کون ہیں"؟

اختر۔" (آنکھیں نکال کر) حضرت ہیں آپ سے پھر عرض کروں گا زبان سنبھالیئے۔

یوسف" آنکھیں دکھانے کی کوشش نہ فرمایئے۔ چوری اور سینہ زوری"

اختر" میں عرض کر رہا ہوں۔ مجھ میں اب برداشت نہیں ہے۔ ہماری جان بچا کر اگر آپ ہمارے محسن نہ بن گئے ہوتے۔ تو" ۔۔ ۔۔ ۔۔"

یوسف" ہاں ہاں کہیئے" ۔۔ ۔۔ ۔۔ تو آپ مجھے جان سے مار دیتے۔ ۔ ۔ بدمعاش کہیں کے ۔۔ ۔۔ ۔۔ سؤر"

اختر (اکھڑے ہوئے) کیا کہا"؟

پستول اُٹھا کر فائر کرتے ہوئے یوسف بولا" یہ کہا"

ایک آہ جگر سوز کے ساتھ اختر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اور سلطانہ اس پر جھکی ہوئی رو رہی تھی۔

یوسف (دانت پیس کر) میں نہ کہتا تھا کہ یہ تیرا عاشق ہے۔ کیسی چمٹ گئی

اپنے یار سے۔ چل الگ ہٹ "

اصغر اور حسن آرا کی ماں پستول کی آواز سے جاگ اُٹھے تھے اور آنکھیں پھاڑے ہوئے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

"کیا قصہ ہے" ؟ اصغر نے دھیمی آواز سے پوچھا۔

یوسف (پستول ہلاتے ہوئے) کچھ نہیں۔ تم لوگ سو جاؤ۔ تمھیں اس قصے سے کوئی مطلب نہیں "

حسن آرا کی ماں نے جلدی سے اپنا منھ رضائی سے ڈھک لیا۔ اور مصنوعی خرّاٹے لینے لگی۔ اصغر نے بھی پستول کی نال اپنی دیکھکر آدھی آنکھیں بند کرلیں۔

"نرائن" یوسف نے گاڑی بان کو آواز دی" ابے او اُلو کے پٹھے۔ نرائن۔ کہاں مر گیا کمبخت۔ یہ کہکر وہ خیمے سے باہر نکل گیا۔

اختر زمین پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اور سلطانہ کے گرم گرم آنسو اس کی پیشانی پر گر رہے تھے۔

یوسف خیمے میں داخل ہوا۔ اسکے پیچھے نرائن آنکھیں ملتا ہوا چلا آرہا تھا۔

یوسف "نرائن۔ اس مردود کو اُٹھا اور دریا میں پھینکدے"

سلطانہ "(گڑگڑاتے ہوئے) نہیں نہیں یوسف بھائی۔ دیکھیے گولی ران میں لگی ہے اسے مردہ سمجھکر پانی میں نہ پھینکیے"

یوسف "(کھڑی انگلی ہونٹوں پر رکھکر) چُپ"

سلطانہ ،، رحم کیجئے ۔ (اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہ رہا تھا)

نرائن ،، (ایک آنکھ ملتے ہوئے) دیا کرو حجور، اس بیچارے کو کاہے پانی میں ڈالو ہو"

یوسف ،، "چپ گدھے کے بچے ۔ بس تجھ سے جو کہا ہے کر "

نرائن ،، (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) ہو سرکار ۔ جو حکم "

یوسف (سلطانہ کا ہاتھ پکڑ کر) ہٹتی ہے یا تجھے بھی پھکوا دوں پانی میں "

یوسف نے سلطانہ کو کھینچکر اختر سے الگ کیا ۔ سلطانہ نے حسرت سے اختر کی طرف دیکھا ۔

کراہتے ہوئے اختر نے کہا ۔

،، سلطانہ گھبراؤ نہیں ۔ خدا پر بھروسہ رکھو "

الغرض نرائن نے اختر کو رسی سے کس لیا اور اس کے منہ پر پٹی باندھنے کے بعد اسے اٹھا کر خیمے کے باہر لے گیا ۔

باب ۲۶

"تینوں ل کے لوٹیں جوانی کے مزے"

سلطانہ روتے روتے بیہوش سی ہو گئی تھی جبھی تو یوسف اسکے منہ پہ پانی کے چھینٹے دے رہا تھا ۔ حسن آرا کی ماں رضائی میں دبکی ہوئی بناوٹی خراٹے لے رہی تھی اصغر خاموش پڑا تماشہ دیکھ رہا تھا ۔

الغرض سلطانہ نے آنکھیں کھولیں اور پہلا لفظ جو اس کے منہ سے نکلا۔ وہ

"اختر" تھا۔

یوسف (غصے سے) پھر وہی اختر۔ تیرا دماغ ٹھیک نہیں ہوا ابتک"

سلطانہ "اختر کو آپنے کہاں بھیجدیا۔ سچ بتایئے"

یوسف (سلطانہ کو گھور کر) جہنم میں"

سلطانہ "خدا کیواسطے بتایئے"

یوسف (جام میں شراب انڈیلتے ہوئے) میں کہتا ہوں اختر کو بھول جا دیوانی" کیا دنیا میں ایک وہی بھرو جوان ہے"

سلطانہ (آنکھیں بند کرکے) "وہ نہ جانے کہاں ہوگا"

یوسف (جل کر) "دریا کی تہ میں۔ اگر اب کی اپنے یار کا نام لیا تو اچھا نہ ہوگا۔ سمجھی (دوسرا جام بھرتے ہوئے) دیکھ کیسا پیارا رنگ ہے۔ تھوڑی سی پی اور پھر میرے ساتھ جوانی کے مزے اُڑا۔ تو بھی کیا یاد کرےگی۔ (جھومتے ہوئے) اس اُلو کے پٹھے اختر کو نہ بھول جائے تو میرا نام یوسف نہیں۔ ہاں یوسف نہیں۔..... یوسف نہیں۔ پھر لیا۔ "..... پھر کیا" "..... کچھ بھی نہیں۔ یوسف نہیں۔ چغد۔

سلطانہ (آنکھیں نکال کر) ہوش میں آیئے یوسف بھائی۔ آپ کو شرم نہیں آتی بہن سے ایسی بیہودہ گفتگو"

یوسف (لڑکھڑاتے ہوئے) "کیسی بہن"..... (جام سلطانہ کی طرف بڑھا کر) لے چکھو تو سہی۔ "..... ذرا سی" "..... بس ذرا سی"

سلطانہ (حقارت سے) "میں اس سے اور اس کے پینے والے دونوں سے نفرت کرتی ہوں"

یوسف (قہقہہ لگاکر) نفرت ؟ ہاہاہا" ..." ..." یہ بھی جب تو تجھے پینا ہی پڑے گی۔ دیکھ کتنے" ..." ..." مزے میں رہوں ہیں"

یوسف اسوقت نشے میں چور ہو رہا تھا۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ آگے بڑھا اور شراب سے بھرا ہوا جام سلطانہ کے منھ کے قریب لے گیا۔ آج تو پلا کے رہوں گا تجھے"

سلطانہ نے طیش میں آکر جام پر ہاتھ مارا اور وہ اس زور سے چھپاکے کیساتھ پتھر پر گرا کہ بیچاری حسن آرا کی ماں کا دل رضائی میں دھک سے ہو گیا۔

"یہ بات ہے" سلطانہ کو گھورتے ہوئے کھلکھلا کے یوسف بولا" اچھا تو دیکھ تماشا" یہ کہکر وہ میز تک گیا اور شراب کی بوتل سے منھ لگا دیا۔ خالی بوتل میز پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"بھئی واہ وا۔ بڑا مزہ ہے"

سینہ اُبھار کو سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے راگ سے کہا۔

"تیری آنکھیں کیا ہیں موتی چور کے لڈو ہیں" والا شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا ہے وہ۔ ہم نے دیکھی ہے کسی شوخ —ایں— کیسی آنکھ؟ مستی بھری آنکھ۔ کیا کہہ رہا تھا میں" ..." ..." ہاں ہاں ... ہم نے دیکھی ہے کسی شوخ کی مستی بھری آنکھ۔ مئے چھلکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانے سے ہاہا،"

دفعتاً وہ سلطانہ کی طرف جھپٹا۔ اور اُسے گود میں اُٹھا کر اپنا بودار منھ اس کے آئینے کی طرح شفاف رخسار کے قریب لانے کی کوشش کرنے لگا۔

یوسف (سلطانہ کو زور سے دباتے ہوئے) بول اب کیا کہتی ہے۔ ہائیں۔

ان مستی بھری آنکھوں میں آنسو"

سلطانہ (اپنا سر زور زور سے ہلاتے ہوئے) چھوڑ۔ مجھے چھوڑ دے کمبخت"

یوسف (قہقہہ لگاکر) ابھی سے ـــــ ابھی تو میں نہیں چھوڑوں گا تجھے۔ تو بھی جوان میں بھی جوان ۔ .... اور یہ .... ہاہا .... چارپائی بھی۔ جوان .... تینوں ملکے .... لوٹیں جوانی کے مزے .... ہاہاہا"

اصغر سے نہ رہا گیا آہستہ سے اُٹھا اور میز پر پڑا ہوا پستول اُٹھاکر نال یوسف کی طرف کرتے ہوئے ڈپٹ کر بولا "خبردار"

یوسف نے پلٹ کر دیکھا اور فوراً سلطانہ کو چھوڑ دیا۔ اب وہ ہاتھ اُٹھائے سہما کھڑا تھا۔

اصغر "بیگم صاحبہ، وہ بکس سے بندھی ہوئی رسّی کھول لائیے۔ جائیے جائیے جلدی کیجئے"

الغرض جلدی سے سلطانہ رسّی کھول کر لائی اور بھولے پن سے اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اسے کیا کروں"؟

اصغر (یوسف کی طرف دیکھکر پستول ہلاتے ہوئے) "ہاتھ پیچھے کرو"

یوسف نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

اصغر "(مسکراکر) بیگم صاحبہ۔ اب آپ ایسا کیجئے۔ اس مردود کے پیچھے جاکر اس کے دونوں ہاتھ خوب کسکر باندھ دیجئے"

(یوسف کو دیکھکر) جناب اگر ذرا بھی آپ اپنی جگہ سے ہلے تو یاد رکھیے

آپ کے سینے کے آر پار ہوگی۔"

غرض سلطانہ نے ڈرتے ڈرتے اپنا کام انجام دیا۔

اصغر "اچھا اب ایک کرسی اس کے پیچھے لیجا کر رکھ دیجئے۔" اور جب یوسف کے پیچھے کرسی رکھدی گئی تو اصغر نے اُسے دیکھتے ہوئے ڈانٹ کر کہا "بیٹھ جاؤ" اور مسٹر یوسف کو بیٹھنا پڑا۔

اصغر "بیگم صاحبہ، اب دوسرے بکس کی رسی بھی کھول لائیے۔"

سلطانہ دوڑ کر گئی اور رسی کھول کر بولی "یہ دو ٹکڑے نکلے۔"

اصغر "کوئی حرج نہیں۔ اور اچھا ہے (مسکرا کر) ایک سے تو ان حضرت کے دونوں پیر باندھ دیجئے اور دوسرے ٹکڑے سے انھیں کرسی کے ساتھ جکڑ دیجئے۔"

یوسف کا اگر بس چلتا تو وہ اصغر کو کچا کھا جاتا مگر پستول کی نال اپنی طرف دیکھکر اس کی روح فنا ہوئی جاتی تھی۔

القصہ مسٹر یوسف کرسی سے باندھ دیئے گئے۔ اور اصغر پستول کو اپنی جیب میں رکھکر حسن آرا کی ماں کی چارپائی کے قریب پہونچا۔ جیسے ہی اصغر نے رضائی اس کے منھ پر سے ہٹائی وہ ہو ہو کر کے اس زور سے چلائی کہ سلطانہ اُچھل پڑی۔

اصغر "(بڑھیا سے) تم کو بھی پلنگ سے باندھ دیں۔ اگر اپنی خیریت چاہتی ہو تو اُٹھو ہمارے ساتھ چلو۔"

بڑھیا (ڈر کر اُٹھتے ہوئے) چلو چلو مگر یہ تو بتا دو۔ کہاں لیجلے گے۔"

اصغر "(بڑھیا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) چلو۔ بکواس نہ کرو۔"

الغرض یہ تینوں خیمے کے باہر آئے۔ صبح صادق تھی نسیم سحری دریا پر سے ہوتی ہوئی جنگلی درختوں کے قریب جا کر اپنی زبان میں نہ معلوم ان سے کیا کہتی کہ وجد میں آکر جھوم جھوم جاتے اور لہک لہک کر نئے نئے گیت گانے لگتے۔

سلطانہ نے دریا کی طرف حسرت سے دیکھا۔ اصغر سمجھ گیا۔ اُسنے کہا۔ "بیگم صاحبہ۔ آپ فکر نہ کریں۔ گاڑی بان نے اُن کو ہرگز پانی میں نہیں ڈالا۔ آپ ذرا غور تو فرمایئے۔ دریا یہ موجود ہے۔ اگر وہ ان کو پانی ہی میں پھینکنا چاہتا تو دو منٹ میں اپنا کام کر کے واپس چلا آتا۔ مگر اس کا دیکھئے ابتک پتہ نہیں۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے کہیں اور لے گیا ہے۔ میرے خیال میں اس نے تھوڑی دور لیجا کر چھوڑ چھاڑ دیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں یہ گاڑی بان آدمی رحمدل ہے"

سلطانہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ سامنے سے گاڑی بان آتا ہوا دکھائی دیا۔

باب ۷

"آن پھنسنے کی بات ہے"

"نرائن نرائن" سلطانہ چلائی "اختر کو تو نے کہاں چھوڑا؟"

"حجور" گاڑی بان بولا "کا بتاؤں جہاں کا حکم تھا وہیں چھوڑا۔ مو تو صاب حکم کا تابعدار رہوں"

سلطانہ اپنا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

اصغر (پستول نکالتے ہوئے) جھوٹ بولتا ہے۔ ۔ ۔ سچ سچ بتا۔ ورنہ یاد رکھ، یہیں ڈھیر ہو جائے گا۔"

نرائن (ہاتھ جوڑ کر کانپتے ہوئے) ارے نہیں حجور! گریب آدمی ہوں۔ بال بچے بھوکوں مر جائیں گے ساب۔"

اصغر (پستول ہلاتے ہوئے) بول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نرائن (ڈرتے ہوئے) ارے ارے۔ بتاتا ہوں حجور۔ بتاتا ہوں۔"

اصغر (ڈپٹ کر) جلدی بتا۔ اختر کہاں ہے؟"

نرائن ،، حجور سچی کہوں (آہستہ سے) پرنتو آپ ساب سے مت کہنا۔ اُنھوں نے سن لیا تو ہماری مٹی پلید ہو جائے گی۔ ساب بات یو تھی کہ موکو۔ اس گریب پے ترس آگیو۔ موئے سوچی کہ وسکو جنگل میں چھوڑ دوں۔ سو وسکو اٹھا کے ہو دراآگے بڑھ گیو۔ پر موکو پھر کھیال آیو کہ پھر کہیں یہ وہیں ساب کے پاس پہونچ گیو تو بڑی بری ہو گیلی۔ سو پچھنے لگو کہ کا کروں۔ اتفاک کی بات ندی میں ہم نے ایک ڈونگا دیکھو۔ بس حجور موئے اس گریب کو ڈونگے میں پٹک دیو اور ڈونگے کو پانی میں جور سے دھکا دیو۔

اصغر ،، پھر کیا ہوا وہ ڈونگا کدھر گیا؟"

نرائن ،، سو نے پھر ڈونگے کو پلٹ کے بھی نہیں دیکھو۔ بس ادھر چلا آیو۔"

اصغر ،، اچھا چل۔ ہم کو وہ جگہ بتا جہاں تو نے اس کو چھوڑا ہے۔"

نرائن ،، ہو سرکار، پر حجرا ساب سے تو کہہ دوں کہ موا اپنا کام کر آیو۔"

اصغر ۔۔ نہیں صاحب سے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے چل کر وہ جگہ ہمیں دکھا۔ چل گاڑی جوت لے۔"

الغرض نرائن نے گاڑی جوتی۔ پہلے سلطانہ پھر حسن آرا کی ماں اور اسکے بعد اصغر گاڑی میں بیٹھے۔ چلتے وقت اصغر نے چلا کر کہا۔

"خدا حافظ یوسف صاحب"

یوسف کی آواز۔۔ احسان فراموش اصغر کے بچے۔ بھول گیا۔ میں نے تیری جان بچائی تھی۔ اب تک تو تیری راکھ کا بھی پتہ نہ ملتا۔"

اصغر ۔۔ بھولا نہیں۔ یاد ہے میرے محسن۔ لیکن اپنے محسن کو برائی سے بچانا میرا فرض ہے۔ گھبرائیے نہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ نرائن آپکو آکر کھول دیگا۔"

نرائن (گھبرا کر) یہ کا کہت ہو حجور۔"

اصغر ۔۔ کچھ نہیں چپکا بیٹھ۔"

نرائن ۔ ہو سرکار۔ (دل میں) آن پھنسے کی بات ہے۔"

اب گاڑی آہستہ آہستہ دریا کے کنارے چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی بان نے دریا کی طرف اشارہ کرکے ہوئے کہا۔ بس حجور یہی جگہ ہے۔"

اصغر نے دریا پر دور تک نظر ڈالی۔ سلطانہ بھی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی لیکن کہیں بھی ڈونگے کا پتہ نہ تھا۔

سلطانہ ۔۔ (اصغر سے) یہاں تو کوئی ڈونگا نظر نہیں آتا۔"

نرائن ۔۔ مونے تو حجور یہیں چھوڑ دکھو سکو۔ بہہ گیو ہوگو۔"

اصغر ۔۔ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ دیکھ سچ سچ بتا دے۔ ورنہ یاد رکھو۔"

نرائن ۔ "جمو چنیا کی سوں ۔ سو سچی بولوں ہوں "
اصغر ۔ "چنیا کون ہے ؟"
نرائن ۔ "موئی بڑی چھوکری "
اصغر ۔ "اچھا گاڑی اس گڑواٹ پر لگا لے "
نرائن ۔ "ہو سرکار ۔ جو حکم "

باب ۲۸

"یہ میرا آپ سے وعدہ ہے "

شہر کے خوبصورت بازار سے نکلکر ٹیکسی سمندر والی ٹھنڈی سڑک پر ہو لی ۔ اصغر ڈرائیور کے پاس اگلی سیٹ پر تھا اور سلطانہ پچھلی سیٹ پر حسن آرا کی ماں کو ابھی بازار میں انھوں نے اُتار دیا تھا ۔ تا کہ وہ گھوڑا گاڑی کر کے اپنے گھر کا راستہ لے ۔

سلطانہ گردن جھکائے کسی گہری سوچ میں پڑی ہوئی تھی ۔ اور اصغر سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح سیٹھ محمود بھائی سے سلطانہ کی ساری داستان بیان کر دیگا ۔ یکایک اُس کو کچھ خیال آیا " بیگم صاحبہ " یقین مانئے ۔ یہ نرائن کا بچہ جھوٹوں کا پیر ہے ۔ اس نے اختر کو یقینی کہیں جنگل میں چھوڑ دیا ہے اور ہم لوگوں کو اس ڈر سے نہیں بتاتا کہ کہیں اس کے صاحب کو نہ معلوم ہو جائے " ۔ تو کیا بیٹا یہ نہیں سمجھتا کہ

یہ کوئی چھپنے والی بات تو ہے نہیں۔ سمجھ کا پھیر ہے۔ گنوار تو گنوار ——— بہر حال کوئی فکر کی بات نہیں۔ میں انشاءاللہ انھیں ضرور ڈھونڈھ نکالوں گا۔ آپ اطمینان رکھیئے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ خدا نے چاہا تو کل تک میں پتہ لگا لوں گا۔"
سلطانہ کی آنکھوں سے جھڑیاں لگی ہوئی تھیں اور نہ جانے کیا کیا خیال اُس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔

باب ۲۹

"آخر ہوا کیا"

پانچ بدمعاشوں میں سے چار تو دلاور کے حکم سے ایک طرف ٹل گئے تھے۔ جسوقت دلاور سلطانہ کی عصمت دری کرنا چاہتا تھا، لیکن پانچواں نظیر دوسری طرف سیٹی بجاتا ہوا نکل گیا تھا۔ نہ جانے اندھیرے میں اپنے دوستوں سے الگ ہو کر وہ کدھر جا رہا تھا کہ آدم خوروں نے اسپر حملہ کیا۔ یہ وہی موٹا تازہ شخص تھا جسکو حبشیوں کی ایک ٹولی گیند کی طرح اُچھالتی ہوئی اپنی جھونپڑیوں کے پاس اسوقت لائی تھی جب دلاور کو کڑھاؤ میں ڈالنے کیلئے سر سے اونچا اُٹھا لیا گیا تھا۔

اب یہ چار بدمعاش سارے جنگل میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کو سخت تعجب تھا کہ دلاور سلطانہ کو لیکر آخر کہاں اوپ ہو گیا۔ اور یہ کمبخت نظیر بھی

کدھر غائب ہو گیا۔ تمام جنگل اُنھوں نے چھان مارا لیکن بے سود۔ اب وہ باتیں
کرتے ہوئے دریا کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔

ایک بدمعاش: "(اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ سفید سفید کیا چیز ہے؟"

دوسرا: "تو تو بس اسی فکر میں مرا جاتا ہے۔ یہ کیا ہے وہ کیا ہے۔"

پہلا: "پگلے تجھ سے کون پوچھتا ہے؟"

دوسرا: "اچھا اور تو بڑا سیانا بنتا ہے۔"

تیسرا: "اماں کیوں لڑتے ہو یار۔"

پہلا: "یہ پاگل ہے بھیا۔"

چوتھا (ہنس کر) "آخر ہوا کیا؟"

دوسرا: "کچھ بھی نہیں یار۔ اس کی تو عقل جاتی رہی ہے۔"

پہلا (دوسرے کو غور سے دیکھ کر) عقل جاتی رہی ہے۔ (چوتھے کو مخاطب کر کے)
رفیق بھائی، ذرا دیکھنا۔ میں نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ وہ ... سفید سفید
چیز جو دکھائی دے رہی ہے کیا ہے۔؟ بس لگا اُلٹی سیدھی بکنے۔ عجیب قسم کا
آدمی ہے۔ دماغ ٹوٹا ہوا ہے اس شخص کا۔"

دوسرا: "ابے دماغ تیرا ٹوٹا ہوا ہوگا۔ رفیق بھائی ... ..."

رفیق بھائی: "اماں ہوگا۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے
کو تیار۔ اُسنے پوچھا بھی تو کیا برا کیا۔ (پہلے کی طرف دیکھ کر) بھیا وہ تمھاری سفید
سفید چیز تو مجھے ڈیرہ معلوم ہوتی ہے۔

باب ۳

"تلی ٹوٹ گئی تھی"

دریا کے بہاؤ کے ساتھ بادِ آدم کے وقت کا ایک ڈونگا کسی چلبلی رقاصہ کی طرح ہزاروں بل کھاتا۔ مچلتا۔ گنگناتا چلا جا رہا تھا اور ایک خوشرو نوجوان اسمیں بندھا بندھا یا پڑا کسی شدید تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ یہ کون تھا۔؟

یہ وہی گردش روزگار کا ستایا ہوا اختر تھا جس نے آنکھ کھولتے ہی مصیبت کی دنیا کو دیکھا۔ اور دیکھ رہا تھا جس نے راحت کا صرف نام ہی نام سنا تھا لیکن جو پریم کے مندر کا سچا پجاری تھا۔

اب ڈونگا اُس جگہ پر تھا جہاں دریا کا میٹھا پانی سمندر کے کھاری پانی سے ملتا تھا۔ اختر کی ران میں ٹیس پڑ رہی تھی۔ کیونکہ یوسف کے پستول کی گولی آر پار نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہڈی کے قریب گوشت میں گھسی ہوئی تیر کی طرح چبھ رہی تھی۔ یکایک ڈونگا گول گول گھومنے لگا۔ اب وہ بھنور میں اسقدر تیز گھوم رہا تھا کہ اختر کو یقین ہو گیا کہ اس کا خاتمہ قریب ہے۔ وہ خدا سے دھیان لگائے آنکھیں بند کیے چپکا پڑا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب دماغ کا چکر کچھ کم ہوا تو اختر نے آنکھیں کھولیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ ڈونگا سمندر کی لہروں پر مسکتا ہوا سیدھا چلا جا رہا ہے۔ اختر کی پیٹھ کو ٹھنڈے پانی کا احساس ہوا۔ ڈونگے کی تلی ٹوٹ گئی تھی۔ اور پانی

آہستہ آہستہ دبس رہا تھا۔

اب اُس نے سوچا " تھوڑی دیر بعد سلطانہ کا سچا عاشق دریا کی تہ میں ہوگا "
کیا کشتی پانی میں غرق ہو جائے گی ؟ کیا اختر کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔

باب ۳۱

" وہ غصّے سے کانپ رہا تھا "

یوسف ڈیرے میں کرسی سے بندھا ہوا اصغر کی جان کو رو رہا تھا۔ غصّے سے اُسکا منہ سُرخ تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔

" اچھا اصغر۔ وہ مزا چکھایا ہو کہ تو بھی یاد کرے عمر بھر۔ ٹھہر جا۔ ذرا نرائن کو آجانے دے۔۔ ۔۔ ۔۔ (زور سے) کون۔ نرائن ؟ اُس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

" آہا، یوسف صاحب " رفیق بھائی نے دروازے پر سے کہا " ارے یہ کیا قصّہ ہے یہاں۔ یہ کس نے آپ کو باندھ دیا "

یوسف (جھینپ کر) پہلے کھولو۔ پھر پوچھنا "

رفیق بھائی " (پلٹ کر اپنے تینوں دوستوں سے) آؤ اندر چلے آؤ۔ اب سب ڈیرے کے اندر تھے اور رفیق بھائی مسٹر یوسف کو کھولنے میں مشغول تھے۔

رفیق بھائی " اُف فوہ۔ تمام برتیں پڑ گئیں۔ یہ کس نے آپ کو اس قدر

کس دیا تھا۔"

یوسف (کھڑے ہو کر ڈبے کی چھت کو غصے سے دیکھتے ہوئے) "ایک منحوس بے ایمان نے ایک احسان فراموش نے۔ جس کو اگر میں نہ بچاتا تو کبھی کا جل بھن کر کباب ہو جاتا۔ آج کل کی دنیا میں نیکی کا بدلہ بدی ہے .... اصغر

اصغر، (آنکھیں نکال کر چھت کو مکا دکھاتے ہوئے) ایسا مزہ چکھایا ہو کہ مرتے مرتے بھی ذائقہ تیری زبان پر رہے۔"

اصغر کا نام سنکر اُن چاروں کے کان کھڑے ہوئے۔

رفیق بھائی "یہ کون بزرگ ہیں؟"

یوسف (غصہ سے) "میں نہیں جانتا اس کا شجرہ مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے ایمان ہے کسی کمین کی اولاد۔ کچھ سوچ کر شاید تمھاری ہی ٹولی کا ہے وہ۔"

رفیق بھائی کچھ کہنا چاہتے تھے کہ نرائن ڈبے میں داخل ہو۔

نرائن "جنیا کی سوں۔ ججو مر گیو۔"

یوسف (زور سے) "کیا بکتا ہے کون مر گیا؟"

نرائن "ججو بھلا مرتا کون۔ گریب ہی مرتے ہیں۔ سو مر گیو آج تو ساب۔"

رفیق بھائی "(ہنستے ہوئے) اور امیر نہیں مرتے۔"

نرائن "ارے ججو مرتے تو امیر بھی ہیں۔ پرنتو ساب ہم گریب بیچارے بہت مرتے ہیں۔ بھاکوں سے ہم مرتے ہیں۔ بیکروں سے ہم مرتے ہیں۔ اور ساب کا کہوں۔ بڑے آدمی کے چرنوں سے کچل کے ہم مرتے ہیں۔ گر ساتھ کے کھڈ ب مرتے ہیں یا ہم موتو ساب سچی بات کہوں ہوں کسی کو بری لگے تو مو کا کر دوں۔"

یوسف۔ چپ گدھے۔۔ ۔۔ کیا ہوا ؟۔ وہ لوگ کہاں گئے۔ تجھے کہاں لے گئے تھے۔؟ اور تو نے اُس بدمعاش کو تو پھینک دیا نا؟"

نرائن۔ ابتلک تو کھبر نہیں کس مچھی کے پیٹ کے بھیتر ہوگو۔ کھیر۔ تو ساب وہ آدمی گاڑی موسے ٹھروا کے لے گیو۔ وا جگہ۔ دیکھنے کے کارن۔ جہاں ہیں نے اس بدماس اک۔ کا کھس۔ آگ۔۔۔۔ الکھتر، ہاں اُکتر کو پانی میں ڈالو تھو۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مو تو کبھی نہیں جا تو اس کے سنگھ ۔۔ ۔۔ پر کا کروں۔۔ ۔۔ جس نے کئی ہے کھوب کئی ہے۔ جان بہت پیاری ہووت ہے۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ موکو جانو پڑو۔ پر موبھی گلت جگہ لے گیو دسکو۔۔ ۔۔ وہ بوبو بدماس تو جھوٹو ہے۔ اور موکو ون نے اتنا مارو کہ جور جور تھاری ہڈیوں ہیں ٹکھار آ گیو۔ پھر ندی کے سنگ سنگ دور تلک موسے وہ گاڑی ہکوائے لے گیو۔ رستے ہیں ایک موٹر مل گیو اور تھاری جان چھٹی۔ اس ہیں بیٹھ کے وہ سب بجنے چل دیو۔ اور مو گاڑی لیکے۔ دُم دبائے جو بھاگو تو بس یاں آ کے جور جور دم لیو۔"

یوسف غصہ سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ بکس سے کارتوس نکال کر ہینڈ بیگ ہیں رکھنے لگا۔

"بیٹے اصغر، کہاں جاؤ گے بچ کے ؟"

وہ بڑبڑایا اور اُن چاروں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

باب ۳۲

"جاؤ، مزے اُڑاؤ" -

سیٹھ محمود "بھئی میں تم سے بہت خوش ہوں - تم نے ایسے وقت پہ میری لڑکی کو مدد دی ہے کہ ... ... "

اصغر (مسکرا کر) یہ تو خاکسار کا فرض تھا"

سیٹھ محمود "تم کیا کام کرتے ہو"؟

اصغر "حضور فی الحال تو بیکار ہی ہوں"

سیٹھ محمود - (ہاتھ بڑھاتے ہوئے) لو یہ تو رکھ لو - مٹھائی کھا لینا اسکی"

اصغر "(محمود بھائی سے ہزار کا نوٹ لیتے ہوئے جھک کر) خدا حضور کی عمر میں برکت دے - زبان اس قابل نہیں کہ شکریہ ادا کر سکے"

سیٹھ محمود "اسکے علاوہ ایک مکان تمھارے نام لکھ رہا ہوں تاکہ مستقل آمدنی ہو جائے تمھاری - کوئی پچیس ہزار کا ہے وہ - دو ڈھائی سو روپئے ماہوار کرایہ آتا ہے اس کا"

اصغر کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں - اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کسطرح سیٹھ محمود بھائی کا شکریہ ادا کرے - گھبراہٹ میں اُس نے سیٹھ صاحب کو دونوں ہاتھوں سے سلام پہ سلام کرنا شروع کیا اور کچھ اس طرح سے کہ

محمود بھائی کو بھی ہنسی آگئی۔

محمود بھائی۔ (ہنسکر) اچھا تو اب تم جاؤ۔ مزے اُڑاؤ۔"

باب ۲۳

"حالت ٹھیک نہیں"

دُھواں اُڑاتا۔ سمندر کی لہروں سے لڑتا لڑاتا ایک چھوٹا سا دُخانی جہاز تیز تیز تا سیدھا چلا جا رہا تھا۔

ڈیک پر دو شخص سوٹ پہنے کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

ایک۔ "داس، اب تو افریقہ میں جی گھبرا گیا۔"

داس۔ "میرا بھی۔"

پہلا۔ "بس تھوڑا سا کام اور رہ گیا ہے۔ پھر چلیں۔"

داس۔ "ہاں بھئی، اب تو دلی بُری طرح یاد آ رہی ہے۔"

پہلا۔ "(دوربین آنکھوں پر رکھتے ہوئے) کئی دن سے خط بھی نہیں آیا۔ نہ جانے گھر کے کیا رنگ ہیں۔"

داس۔ "کیا دیکھ رہے ہو"؟

پہلا۔ "کچھ نہیں ویسے ہی۔"

داس۔ "ذرا مجھے دینا رشید۔"

رشید۔ (دوربین دیکر آنکھیں ملتے ہوئے) چائے پینا چاہیے "

داس (دوربین سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) منگاؤ۔

رشید "چلو اب نیچے ہی چل کے پی لیں گے"

داس "(سمندر کی سطح کو دوربین میں سے گھورتے ہوئے) کشتی......

ڈوب رہی ہے... ... ... ہیں ... ... اس میں

تو ایک آدمی بھی ہے "

رشید (گھبرا کر) کیا کہتے ہو "؟

داس (دوربین رشید کو دیتے ہوئے) دیکھو" ... ... وہ سامنے "

رشید" کہاں ؟ ... ... ہاں کچھ ہے تو" ... ... ٹھیک کہتے ہو۔

نہ جانے یہ غریب زندہ ہے یا مردہ۔"

داس "دیکھنا تو چاہیئے۔ ... ... ان لوگوں سے کہو بچائیں اسے،

نہ جانے کون ہے غریب۔ چلو"

قصہ مختصر تھوڑی دیر بعد جہاز کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اختر

بیہوش پڑا تھا اور جہاز کا ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی کوشش

کر رہا تھا۔ قریب ہی داس اور رشید بیٹھے ہوئے کبھی ڈاکٹر اور

کبھی اختر کو دیکھ رہے تھے۔ یکا یک ڈاکٹر نے رشید کی طرف دیکھکر

منہ بناتے ہوئے کہا۔

"حالت ٹھیک نہیں ہے۔ سرسامی کیفیت ہے"

باب ۳۴

"کب آؤ گے تم"

ماں باپ کی جس نے قدر نہیں کی۔ شاید وہ دنیا میں کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

کس کو پڑی ہے جو مفت میں رو رو کر اپنی جان ہلکان کرے کس کو پڑی ہے جو رات دن دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کسی کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ اس مادّی دنیا میں شاید کوئی کسی کا نہیں۔ سب اپنے مطلب کے آشنا ہیں۔ لیکن ماں کی محبت دنیاوی چیز نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بھلا ایسی بے غرض محبت سوائے ماں کے اور کون کر سکتا ہے۔

بیچاری ماں .... بیچاری ماں اب اختر کی جدائی میں گھٹیا سے لگ چکی تھی۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اختر مہینوں برسوں سے غائب ہو۔ روتے روتے اُس کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ دروازے پر اس کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔

"اختر بیٹے کب آؤ گے تم؟ بوڑھی ماں کو مرتے وقت بھی صورت نہیں دکھاؤ گے کیا؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب وہ چند دنوں کی مہمان ہے۔

باب ۳۵

"اسپتال لے چلو اسپتال"

رات کے دو بج رہے تھے۔ روتے روتے سلطانہ کی ابھی آنکھ لگی تھی کہ وہ چونک پڑی۔ کسی نے خواب میں اس سے کہا تھا۔ "اختر مصیبت میں ہے دریا کے کنارے۔۔۔" "دریا کے کنارے والے گاؤں میں۔ جا اُسے بچا۔ اسی وقت جا۔" "یوسف اس کے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگانا چاہتا ہے۔ جلدی کر۔۔۔" سلطانہ گھبرا کے اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"میں جاؤں گی، کچھ بھی ہو، میں جاؤں گی۔ ورنہ یوسف۔۔۔" مسہری پر سے کود کر اُس نے الماری کھولی۔ ٹارچ کو روشن کیا۔ خاکی برجیس نکال کر پہنی۔ پھر بند گلے کا خاکی کوٹ پہنا۔ سر پر ایک خاکی رومال باندھا۔ جیب میں بھرا ہوا پستول رکھا اور اللہ کا نام لے کر اپنے کمرے سے نکلی۔ برآمدے میں ایک سرخ بتی جل رہی تھی جس کی دھیمی دھیمی روشنی زینے کے قریب والے سفید گلاب کے پھولوں کو خون میں رنگے دے رہی تھی۔ دبے پاؤں یہاں سے نکل کر وہ باغ میں آئی۔ چند سکنڈ کے لیے ٹھہری۔ ادھر ادھر دیکھا اور اب تیز تیز قدم رکھتی ہوئی نارنگی کے درختوں سے

سے ہوتی کنوئیں کے قریب سے گزرتی باغ کی منڈیر کی طرف گردن جھکائے وہ کچھ سوچتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد باغ سے نکلکر جو راہ ہے پر کھڑی شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ دریا کے کنارے والے گاؤں کا (جس کے متعلق اُسے خواب میں بتایا گیا تھا۔) کون سا راستہ ہے۔ الغرض وہ دریا والی سڑک پر ہولی۔ دریا یہاں سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ دریا کے کنارے سڑک پر دوڑی جارہی تھی۔ دفعتاً وہ ٹھہر گئی اور گھور گھور کے دریا میں نہ جانے کیا دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن اندھیرے میں اُسے کیا خاک نظر آتا۔ اُس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لی۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر آگے بڑھی۔ ایک پل آیا۔ چند منٹ بعد وہ اُس پُل کو پار کر کے سامنے والی جھونپڑیوں کی طرف ہولی۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کیا۔ اسلئے وہیں املی کے درخت کے نیچے وہ چبوترے پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی یہ کیا یہی گاؤں ہے جہاں " . . . . . . "

دور سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔

"ارے کون ہے رے" کسی نے زور سے چلا کر کہا۔

"کوئی نہیں بھیا۔ رستہ گیر ہے، ذرا یہاں تو آؤ" سلطانہ بھاری آواز سے بولی۔

یکایک ایک رسی اُس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔

"ہائے کاٹ لیا" وہ زور سے چلا پڑی۔

"کسی کو املی والے ناگ نے کاٹ لیا" کوئی چلا کر بولا۔

"دوڑیو رے دوڑو"

دوسری آواز "کدھر ہے وہ"

پہلی آواز "املی کے نیچے"

تیسری آواز "ارے اب وہ کیا بچے گا۔ بڑا زہریلا ناگ ہے وہاں۔

چوتھی آواز "اسپتال لے چلو اسپتال"

باب ۳۶

"موٹر فوراً رک گئی"

آج اصغر کے پاس ایک ہزار روپیہ تھا اور کل ایک مکان اُس کے نام لکھا جانیوالا تھا۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ بے انتہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خوشی سے اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ سیٹھ محمود کی کوٹھی سے وہ سیٹھ صاحب کو دل ہی دل میں لاکھوں دعائیں دیتا ہوا نکلا۔ وہ سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا "دیکھو نیکی کا بدلہ خدا نے مجھے کیسا اچھا دیا۔" دلاور[1] بیچہ قوف، دیکھ تیری نیت خراب تھی تو تو آدم خوروں کے کڑھاؤ میں

---

[1] سلطانہ کی زبانی اصغر دلاور کا انجام سن چکا تھا۔

کیسا چرمرُ ہو کے رہ گیا۔ اب میں ان کمبخت چوروں کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ اور بدی سے جہاں تک ہو سکے گا بچوں گا۔ اگر انسان کو پیٹ بھر کھانے کو ملے تو وہ چوری کیوں کرے۔ اگر دنیا میں روپئے کی تقسیم انصاف سے کی جائے تو ایک چوری کیا۔ بہت سی بری باتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی آنکھیں کب کھلیں گی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

یہی سب وہ سوچ رہا تھا۔ دو مرتبہ اسے سیٹھ محمود والے "ہزار کے نوٹ کو بھی نکال کر دیکھا اور پھر جلدی۔ جیب میں رکھ لیا۔ آج میری بیوی بچے کتنے خوش ہوں گے جب اُن کو یہ معلوم ہو گا کہ اب دونوں وقت انھیں پیٹ بھر کر روٹی ملا کرے گی۔ بیوی چیتھڑے لگائے نہیں پھرے گی۔ بچے سردی میں کانپتے ہوئے ننگے نہیں پھریں گے۔ اب وہ ہرگز رو رو کر یہ نہیں کہیں گے۔ کہ "ابا ہمنو بھل دی لدی ہے" جس کو سنکر میرا کلیجہ کانپنے لگتا ہے اور میں چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اب میں اُن کو اچھے سے اچھے کپڑے پہناؤنگا امیروں کے بچے جب سنئے نئے کھلونوں سے کھیلتے ہیں تو میرے بچے کیسے للک کر میرے پاس آتے ہیں "ابا ہم بھی ایت موتل لیندے"

اب میں بھی بہت سے کھلونے دلا دونگا۔ وہ کتنے خوش ہوں گے۔ میری گود میں آکر بیٹھ جائیں گے۔ مجھے پیار پر پیار کرنے لگیں گے۔ اسوقت خوشی سے میرے آنسو نکل پڑیں گے۔ میں اُن کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہوں گا کھیلو میرے بچو کھیلو۔ اللہ نے ہم پر فضل کیا۔ شکر ہے اس کا۔ اصغر ان ہی خیالات میں گم چلا جا رہا تھا۔ وہ مسجد کی طرف سے گذرا۔ بہت دنوں سے میں نے نماز نہیں پڑھی

دو رکعت نماز شکرانے کی تو پڑھ لوں۔ آج سے میں ضرور نماز شروع کر دونگا روروکر اس معبود سے اپنے پچھلے گناہ بخشواؤں گا۔ سجدے کر کر کے اُسے مناہی لوں گا۔ لیکن نہیں خالی سجدوں ہی سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اس کی خدمت کرنا چاہیئے۔ مگر اس کی خدمت کس طرح کروں؟ میرے خیال میں تو اسکی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُن غریبوں کی مدد کروں جن کے بچے میرے بچوں کی طرح بھوکے مر رہے ہیں جن کے لخت جگر ان کی آنکھوں کے سامنے سردیوں میں ٹھٹھر کے رہ جاتے ہیں۔ جن کو سماج چور بنا کر ڈاکو اور قاتل بنا دیتا ہے اور پھر ایک دن اُن کو سزائے موت کا حکم سنا کر پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیتا ہے۔ جب سماج بھوک کو رفع نہیں کر سکتا۔ تو اسے سزا دینے کا کیا اختیار ہے؟"

اصغر کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ جوتا اُتار کر مسجد میں داخل ہوا۔

وہ جوش میں بھرا ہوا تھا۔ خدا کے سامنے خوب رویا۔ اور غریبوں کیلئے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ جب وہ مسجد سے نکلا تو اُسنے اپنی طبیعت میں کچھ ہلکاپن سا محسوس کیا۔ پھر اُسے کچھ خیال سا آیا۔ اُس نے سلطانہ سے کوئی وعدہ کیا تھا ہاں ہاں وہ اختر کو ڈھونڈھ کے رہیگا۔ کیا وہ پولیس میں یوسف کی رپورٹ کر دے؟ نہیں یوسف نے اس کی جان بچائی تھی۔ سیٹھ محمود خود یوسف کو سمجھ لیں گے۔"

جیسے ہی وہ سڑک کو پار کر کے دوسری طرف جانا چاہتا تھا کہ ایک تیز رفتار موٹر نے اُسے روند ڈالا۔ موٹر فوراً رک گئی۔ ڈرائیور نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اصغر کو موٹر کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ پھر منہ لٹکائے ہوئے موٹر اسٹارٹ

کی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

باب ۳۷

"کچھ نہیں"

اختر ابتک بیہوش تھا۔ جہاز والوں نے اسے شہر کے اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔ جہاں اُسنے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں ذرا بھی آنکھ نہیں کھولی تھی۔ اس کی ران پر پٹی بندھی ہوئی تھی (گولی اُس کی ران سے نکال لی گئی تھی) ڈاکٹر اُسے ہوش میں لانے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ اسکا بدن بالکل دھویا کپڑا ہو رہا تھا۔ جیسے اسمیں ایک قطرہ خون بھی نہ ہو۔

دفعتاً اختر نے آنکھیں کھولیں (آنکھیں پھاڑ کر "آہا ئیں۔ میں کہاں ہوں"؟

"اسپتال میں۔" نرس نے جواب دیا۔

"کیوں"؟ اُس نے پھر آنکھیں پھاڑ دیں۔"

"گھبرایئے نہیں۔ اب آپ بالکل اچھے ہیں۔" نرس آنکھیں مٹکا کر بولی۔"

"اچھا ہوں"؟ اختر نے چاروں طرف دیکھا۔

"ہاں بالکل اچھے ہیں آپ" نرس مسکرائی۔

"کیا ہو گیا تھا مجھے"

"ہیں ۔۔۔۔ پاؤں میں درد کیوں ہوتا ہے"؟

"کچھ نہیں۔ آپ بالکل اچھے ہیں۔ لیجئے۔ یہ دوا پی لیجئے"

نرس نے دوا کا گلاس اختر کے منھ سے لگا دیا۔ گلاس ہٹاتے ہوئے

وہ بولی: "آپ بالکل اچھے ہیں اب"

اختر اپنے ہونٹوں میں کچھ بدبدایا اور ایک دفعہ پھر بیہوش ہو گیا۔

باب ۳۸

"کہیں پولیس"

یوسف حسن آرا طوائف کے یہاں گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اور حسن آرا کی ماں رو رو کر سفید جھوٹ بول رہی تھی کہ کس طرح راستہ میں اصغر اور سلطانہ نے اس کی گت بنائی تھی اور یوسف کو کیسی سیدھی سیدھی گالیاں وہ لوگ دے رہے تھے۔ بڑھیا کچھ اس طرح نمک مرچ لگا کر کہہ رہی تھی کہ یوسف غصے سے بالکل چقندر ہو گیا۔ جتنا جتنا اسکے غصے میں اضافہ ہوتا اتنے ہی زور سے وہ حقے کا کش کھینچنے لگتا۔ اور بھاری آواز سے "ہوں" کہکر چپ ہو جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکی آنکھوں میں انگارے بھرے ہوئے ہیں۔ انتقام کی آگ اُس کے سینے میں جل رہی تھی۔ عین مزے کے وقت اس کمبخت اصغر نے سلطانہ کو اس کے پنجے سے چھڑا لیا تھا۔

وہ اصغر جس کی جان اُس نے بچائی تھی۔ وہ اصغر جو آگ کے شعلوں میں جل بھن کر راکھ ہو جاتا۔ پھر اس منحوس احسان فراموش اصغر نے اسکو کرسی کیساتھ بندھوا دیا تھا۔ نیکی کا بدلہ بدی ... ... وہ اس سے ضرور انتقام لے گا ... ... ضرور لے گا ... ... اس نابکار اصغر کے بچے سے ... ... اور وہ ... ... اور وہ بلی جیسی آنکھوں والی لونڈیا ... ... وہی کمبخت جو اس بدمعاش اختر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ وہی کمبخت جو میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ ... ... حرافہ کہیں کی ... ... وہ کہاں جائیگی بچ کر"

"میں ان دونوں سے بدلہ لے کے رہوں گا۔ جب تک بدلہ نہ لے لوں چین مجھے نصیب نہیں ہو سکتا"

اُس نے حقہ کی نئے سے منہ لگا کر زور سے کھینچا۔ مگر میں نے بھی اُس کے یار کو کیسی سزا دی ہے۔ اب تک تو بیٹا اختر کو بقول نرائن کے مچھلیوں نے کھا پی کر برابر بھی کر دیا ہوگا۔ ... ... لیکن ... ... کہیں ان کمبختوں نے میری رپورٹ نہ کر دی ہو۔ ... ... ضرور کی ہوگی۔ کہیں پولیس ... ... وہ سوچنے لگا۔

جیسے ہی حسن آرا ہاتھ میں شربت کا گلاس لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اس کی ماں اُٹھکر چلی گئی۔

یوسف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ سے شربت کا گلاس لیکر اس کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

باب ۲۹

"اب اُس کو چکر آنا شروع ہو گئے تھے"

ہسپتال کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لوہے کے پلنگ پر پڑی ہوئی ایک
حسین لڑکی اونگھ، اونگھ کر بار بار سونے کی فضول کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ
جب یہ ذرا بھی اونگھتی تو ایک موٹی سی نرس اس کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلا دیتی
اور کسی طرح بھی اُسے سونے نہ دیتی۔ شاید یہ اسلئے تھا کہ سانپ کے کاٹے
ہوئے کو نیند بہت آتی ہے اور اگر وہ سو جائے تو پھر اس کا جاگنا ذرا مشکل
ہی ہے۔ یوں تو اس گاؤں کے ایک گنوار نے (جہاں سلطانہ کو سانپ نے کاٹا تھا)
مور کے پر کے تاج کا ایک چھوٹا سا نیلا ریشہ نکال کر گڑ کی گولی میں اسے کھلا دیا تھا
اس گنوار کا دعویٰ تھا کہ اس دوا کو اگر سانپ کے کاٹنے کے فوراً بعد ہی کھلا دیا
جائے تو پھر وہ شخص مر نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ گاؤں کے پٹواری نے بھی
جو اسوقت وہاں موجود تھا۔ سلطانہ کے زخم میں پوٹاشیم پرمیگنیٹ (جسکو یہ ہمیشہ
ایسے موقعوں کیلئے ساتھ رکھتا تھا) بھر دیا تھا۔ تب بھی پٹواری کی رائے سے
گاؤں والے سلطانہ کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے آئے تھے۔ جہاں اب
یہ لیٹی ہوئی اونگھ رہی تھی۔ اسے اسوقت بیحد پسینہ آ رہا تھا۔ اور یہ بار بار
پسینے کو اپنی آستین سے پونچھ رہی تھی۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد نرس اس کے منہ میں دو دو چمچے دوا ڈالدیتی

تھی۔ اور گھنٹہ گھنٹہ بھر کے بعد ڈاکٹر بھی اسکو آ کے دیکھ لیتا تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اگر چکر نہیں آئے تو وہ بچ جائے گی۔ لیکن اب اس کو چکر آنا شروع ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر نے ابھی ابھی اس کے والد سیٹھ محمود کو بھی ٹیلیفون کر دیا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی موٹر میں روتے پیٹتے چلے آ رہے تھے۔

سلطانہ مرنے سے پہلے اختر کو ایک نظر دیکھ لینا چاہتی تھی لیکن اس غریب کو کیا پتہ کہ اس کا اختر بھی اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں پڑا موت کے خواب دیکھ رہا ہے۔

باب ۴۰

مصیبت آئے تو مسکراؤ

اسی ہسپتال میں جہاں سلطانہ اور اختر الگ الگ کمروں میں پڑے ملک الموت کا انتظار کر رہے تھے۔ اصغر بھی ایک کمرے میں پڑا تھا۔ موٹر سے ٹکر کی وجہ سے اسکا سر کنپٹی کے پاس سے پھٹ گیا تھا جسمیں سے خون جاری تھا۔ چار ٹانکے آئے جب کہیں جا کے خون بند ہوا غریب کوئی بارہ گھنٹے بیہوش رہا۔ لیکن اب تو یہ ہوش میں آ چکا تھا۔ اور اس آفت ناگہانی پر پڑا ہنس رہا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ جب مصیبت آئے تو مسکراؤ۔

"یہ سب کچھ میرے گناہوں کا کفارہ ہے۔"

لیٹا لیٹا وہ سوچتا گیا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا کہیں کسی نے وہ ہزار کا نوٹ تو نہیں اُڑا دیا۔ نوٹ اس کی جیب میں موجود تھا۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر نرس کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ قریب آ گئی تو آہستہ سے اُس نے کہا "بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔"

"کیا کھاؤ گے"؟ نرس نے مسکرا کر کہا۔

"جو کھلاؤ۔" اصغر کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

"زیادہ ہنسو مت۔ ٹانکوں پر زور پڑے گا۔" یہ کہکر نرس چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک کٹورا لیئے ہوئے واپس آئی۔

"لو ابھی تو تم کو یہی ملیگا۔"

"کیا ہے"؟

"دُودھ۔"

نرس نے دودھ کا کٹورا اصغر کے منھ سے لگا دیا۔ اور غٹ غٹ غٹ وہ سب پی گیا۔

"اتنے سے کیا ہوتا ہے"؟ وہ مسکرا کر بولا۔ "میری داڑھ بھی گرم نہیں ہوئی۔"

"بس اب سو جاؤ۔" نرس بولی۔ "زیادہ باتیں نہ کرو۔ نہیں تو تمہارے سر میں درد ہونے لگے گا۔"

اصغر نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"بس دو تین دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اُس نے سوچا۔ "بال بچے بھی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں مر گیا" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "اوہ مجھے اپنا وعدہ بھی تو پورا کرنا ہے۔ جو سلطانہ سے کیا تھا میں نے۔ وہی اختر کے ڈھونڈھنے کا۔"

اس غریب کو کیا پتہ کہ اختر بھی اسی اسپتال میں موجود ہے۔ اور سلطانہ بھی یہیں آ گئی ہے۔

باب ۴۱

"کیا تم کر سکو گی۔"؟

اب اختر کو پھر ہوش آ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے دونوں ہاتھ انجکشنوں سے گود ڈالے۔ ابھی ابھی نرس دوا پلا کے گئی تھی۔

وہ خاموش ٹکٹکی باندھے چھت کو دیکھ رہا تھا۔ "نہ جانے سلطانہ کہاں ہو گی وہ غریب تو یہی سمجھ رہی ہو گی کہ اختر مر گیا۔ کیسی تڑپ رہی تھی اُس دن" ۔ ۔ جب اُس ظالم بھائی نے" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا نام تھا اس کا۔ ۔ ہاں یوسف جب یوسف نے مجھ پر فائر کیا تھا۔ نہ جانے پھر اس بیچاری پر کیا گزری۔ وہ بدمعاش شراب میں دھت ہو رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کرے میری سلطانہ اچھی ہو۔ کتنی اچھی ہے وہ" ۔ اختر سوچے جا رہا تھا۔ "میرا دنیا میں بیٹھا ہی کون ہے ایک وہ" ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک میری بوڑھی ماں" ۔ ۔

آہ ۔۔۔ میں اپنی بوڑھی مصیبت زدہ ماں کو تو بھول ہی گیا۔ کتنا برا ہوں میں۔ وہ تو یقیناً رنج سے پاگل ہو گئی ہو گی۔ اُس غریب کو کچھ خبر نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ نہ جانے کیا کیا خیال اس کے دل میں آ رہے ہوں گے۔ میں اُسے کیسے خبر دوں کہ میں یہاں ہوں۔ اس نرس کو بلاؤں۔ اس سے کہوں۔ شاید یہ میری کچھ مدد کر سکے۔"

اختر نے نرس کی طرف (جو ذرا دور کھڑی تھی) دیکھا۔ وہ فوراً ہی آ گئی اور بولی "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ ایک کام ہے۔ کیا تم کر سکو گی۔ اختر نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کام ہے۔ میں ضرور کر دوں گی۔"

"میری ماں کو بلا دو۔"

جب اختر نے نرس کو اپنی ماں کا پتہ بتایا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

"آج نہیں۔ میں کل ضرور بلوا دوں گی اُن کو۔"

"شکریہ" اختر کے منہ سے نکلا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کیا سلطانہ سے بھی کہلا بھیجے کہ وہ ہسپتال میں پڑا ہے۔ ذرا اپنی صورت دکھا جاؤ اس بدنصیب کو۔ مگر نہیں۔ خدا جانے اس کے والدین کیا سمجھیں۔ لیکن اگر چپ کے سے اُس کو خبر بھیجوں تو"؟

ابھی ادھیڑ بُن میں اختر کی آنکھ لگ گئی۔

باب ۴۲

"ایکس رے کرنا ضروری ہے"

حسن آرا طوائف پیٹ کے درد کے مارے مچھلی کیطرح تڑپ رہی تھی اسکی ماں اور چھوٹی بہن دل آرام اس کے پلنگ کے قریب گھبرائی ہوئی کھڑی تھیں

حسن آرا۔ (زور زور سے کانپتے ہوئے) آج تو بس میں مری جا رہی ہوں۔ اتنا سخت درد میرے کبھی نہیں ہوا تھا۔۔۔ ۔۔۔

۔۔۔ اماں ڈاکٹر صاحب ابھی تک نہیں آئے۔۔۔ ۔۔۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔۔۔ ۔۔۔ اُف۔۔۔ اُف۔۔۔ ۔۔۔ فوہ۔۔۔"

ماں:۔ آنے ہی ہوں گے بیٹی گھبراؤ نہیں، یوسف میاں دوڑے ہوئے گئے ہیں تمھارے لئے"

دل آرام:۔ (جھک کر کھڑکی میں دیکھتے ہوئے) لو آپا۔ وہ ڈاکٹر صاحب آ گئے"

ایک منٹ بعد یوسف مع ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔

حسن آرا:۔ (زور سے چلا کر) خدا کیلئے مجھے جلدی کوئی دوا دو۔ میں مری جا رہی ہوں"

ڈاکٹر (گردن ہلا کر) نہیں نہیں بس ابھی آپکا درد بند ہوا جاتا ہے"

یوسف (ڈاکٹر کی طرف دیکھکر) اتنا سخت دورہ ان کو کبھی نہیں پڑا تھا"

ڈاکٹر (حسن آرا کا پیٹ دبا کر) اسوقت تو میں ان کو انجکشن دیئے دیتا ہوں۔ درد کم ہو جائے گا اور انھیں نیند بھی آ جائے گی لیکن ان کا ایکس رے کرنا ضروری ہے

کل صبح کو تمہیں ہسپتال لے آئیے۔"

الغرض ڈاکٹر صاحب نے حسن آرا کے بازو میں ایک انجکشن لگا دیا اور فیس لیکر آداب عرض کرتے ہوئے چمپت ہو گئے۔

باب ۴۳

"اُس نے سب کو بچا لیا"

سیٹھ محمود بھائی دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ہوئے ہسپتال کے برآمدے میں تیز تیز ٹہل رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی سخت پریشانی میں مبتلا ہیں۔ کبھی سر پکڑ لیتے۔ کبھی رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگتے۔ لمبی لمبی سانسیں لیکر کبھی انگلی دانتوں کے نیچے دبا لیتے۔ برآمدے کی چھت کو دیکھنے لگتے۔ پھر زمین کو گھورنے لگتے۔ سگریٹ کے بجائے دیاسلائی کی تیلی منھ میں لیکر جلانے کی کوشش کرتے۔ پھر اپنے آپ چونک پڑتے اور ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتے۔ منتیں مانتے۔ غرض سیٹھ محمود ایک عجیب پریشانی کے عالم میں تھے۔ دفعتاً سلطانہ کے کمرے سے ڈاکٹر مسکراتا ہوا نکلا۔

"کوئی گھبرانے کی بات نہیں سیٹھ صاحب۔ اللہ نے اپنا فضل کیا۔ وہ خطرے جاتے رہے۔ اب کوئی ڈر نہیں۔ اندر تشریف لے چلئے۔"

سیٹھ محمود بھائی خوشی سے رو دیئے۔ برآمدے کی چھت کو دیکھا اور

سلطانہ کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

یکایک ہسپتال کی پشت والی کھڑکی سے ایک سر نکلا۔ اور آہٹ پاتے ہی نیچا ہو کر فوراً غائب ہو گیا۔ کسی نے اسکو نہیں دیکھا لیکن اُس نے سب کو دیکھ لیا۔

باب ۲۴

"کہیں نرس تو نہیں آرہی"

اصغر اسپتال میں پڑے پڑے گھبرا گیا۔ اُس نے کئی بار کہا بھی کہ ابتو وہ اچھا ہو گیا ہے اب اُسے گھر جانے دیا جائے۔ لیکن ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ ابھی اسے دو تین دن اور ٹھہرنا پڑیگا۔

اصغر (نرس سے) لیکن ابتو میں بالکل اچھا ہوں۔ پھر مجھے کیوں روک رہے ہو تم لوگ۔"

نرس۔" ایک دو روز ٹھہرنے میں تمھارا حرج ہی کیا ہے"

اصغر۔" حرج یہ ہے کہ میرے بچے بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان کو یہ تک پتہ نہیں کہ ان کا باپ گیا کہاں ؟"

نرس (آنکھیں چلا کر) تو بلوا لو ان کو یہاں۔

اصغر۔" کس سے بلوالوں ؟ میں خود جاؤں گا"

نرس۔" (سینہ اُبھار کر) لیکن ابھی تو تم کو جانا نہیں ملیگا۔"

یہ کہکر نرس منکتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور اصغر دانت پیکر رہ گیا۔
"اگر اسوقت اس کھڑکی سے کود کر نیں یہاں سے بھاگ جاؤں تو یہ سب
کیا کریں گے میرا۔ اندھیرا تو ہو ہی گیا ہے اور اسوقت اسپتال کے پیچھے بھی کون
ہوگا۔ مگر احتیاطاً ذرا جھانک کر دیکھ تو لوں"
اُس نے کھڑکی سے گردن نکال کر دیکھا۔ اندھیرا گھپ۔ مسکراہٹ اُس
لبوں پہ دوڑ گئی۔ پلٹ کر اُس نے کمرے میں دیکھا۔ کہیں نرس تو نہیں آرہی۔
اللہ کا نام لیا۔ پیر باندھکر دھم سے کھڑکی کے نیچے کودا۔ اور تاریکی میں غائب ہوگیا
اصغر تو یہی سمجھا کہ کسی نے اس کو دیکھا نہیں لیکن ایک نقاب پوش (جو
املی کے درخت کے قریب تھا۔) اس کو جلتے ہوئے چھپا دیکھ رہا تھا اور اب تو سڑک
کی روشنی میں اُس نے اصغر کو اچھی طرح پہچان بھی لیا تھا۔

باب ۴۵

"بُخار کافی تیز ہے"

اختر آج بےچینی سے اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ نرس نے اُس سے
وعدہ کیا تھا کہ وہ آج اس کی ماں کو ضرور ملوا دیگی۔
اختر (نرس سے جو ابھی ابھی کمرے میں آئی تھی) ابھی تک تو آئی نہیں"
نرس (جھلا کر) آدمی تو میں نے صبح ہی بھیجدیا ہے"

اختر ،، نہ جانے کیسی طبیعت ہوگی اُن کی"

نرس ،، آپ فکر نہ کیجئے ابھی معلوم ہو جائے گا۔ دیکھئے آپ کے گالوں پر ہلکی ہلکی سُرخی آ چلی ہے۔ بس ایک ہفتہ بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائے گا"

اختر (جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو) یہ آدمی نہ جانے کب تک آئے گا۔ اتنا وہ کہنے پایا تھا کہ خادم نے کمرے میں داخل ہو کر نرس سے کہا۔

"وہ تو بیہوش پڑی ہوئی ہیں۔ بخار کافی تیز ہے۔ مکان بڑی مشکل سے ملا اسی لئے دیر ہوگئی"

اختر (گھبرا کر) کون بیہوش پڑی ہوئی ہیں۔؟ امّاں"

نرس نے خادم کو آنکھ کا اشارہ بھی دیا لیکن اس کے منہ سے نکل ہی گیا۔

"جی ہاں"

اختر (اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر) تم نے میرے متعلق کچھ نہیں کہا اُن سے"

خادم ۔ کہتا کیا۔؟ ہوش میں ہوتیں تو کچھ بات بھی کرتا"

نرس ،، آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی بند گاڑی بھیجکر ان کو یہیں اسپتال میں داخل کئے لیتی ہوں"

اختر ،، شکریہ آپ کا"

نرس (جاتے ہوئے) میں ابھی ڈاکٹر صاحب سے کہکر گاڑی کا انتظام کراتی ہوں (خادم سے) للّو دیکھو تم کہیں جانا نہیں۔ بس ابھی آتی ہوں۔ گاڑی کے ساتھ تم کو جانا ہے۔

باب ۴۶

"چپ کے سے سلو پائزن"

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ یوسف حسن آرا طوائف کے کوٹھے سے اُتر کر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں اسوقت عجیب خیالات چکر لگا رہے تھے۔ آج اس کو حسن آرا کی ایکسرے کی رپورٹ مل گئی تھی۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ شاید پیٹ میں پھوڑا ہو۔ اسی وجہ سے اُس نے ایکس رے کرایا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ پھوڑا وڑا نہیں تھا۔ اور اگر کہیں یہ کمبخت پھوڑا ہوتا تو پھر تو آپریشن کرانا ہی پڑتا۔ یہ آپریشن بھی کتنی خطرناک چیز ہے خصوصاً پیٹ کا۔ کیا پتہ وہ بچتی یا نہیں۔ طوائف ہو کر کتنی باوفا تھی وہ۔ یوسف سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ آج وہ بیحد خوش تھا۔ نہ صرف اسوجہ سے کہ حسن آرا کے پیٹ میں پھوڑا نہیں تھا بلکہ اس لیئے اور کہ آج اُس نے اختر کو ہسپتال میں دیکھ لیا تھا۔ اُسے زندہ دیکھ کر یوسف کو خوش تو نہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ صرف اس لیئے خوش تھا کہ اب کوئی اُسے اختر کا قاتل نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگرچہ قاعدے سے تو مقدمہ اس پر اب بھی چل سکتا ہے۔ لیکن اونہہ.... وہ پرواہ نہیں کرتا۔ اُس نے ایسے مقدمے بہت لڑے ہیں۔ وہ سب کچھ سوچ چکا ہے۔ اب تو کسی صورت سے اختر کو گانٹھنا چاہیئے۔ معافی مانگ کر کسی طرح اُس سے دوستی پیدا کرنا چاہیئے اور ایک دن دعوت میں چپ کے سے سلو پائزن.... بس....

جس دن سے آدمی چھ مہینے میں جھیک جھیک کے مرتا ہے۔ یوسف مسکرا دیا۔ یہ اختر مجھ سے بچکر جائے گا کہاں۔؟ لیکن اگر کہیں اس کمبخت نے مجھے معاف نہیں کیا اور میری دوستی کو ٹھکرا دیا تو۔۔ ۔۔ ۔۔؟ اونہہ ۔۔ ۔۔ دیکھا جائے گا۔ پہلے کرتو لوں۔۔ ۔۔ اپنی سی۔۔۔۔"

یہی سوچتا ہوا وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔

باب ۴۷

"ہوشیار رہو"

اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھی ہوئی سلطانہ ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی آج صبح وہ اپنے والدین کے ساتھ گھر آگئی تھی۔ اُسنے اپنی والدہ سے صاف صاف کہدیا تھا کہ وہ اختر سے محبت کرتی ہے۔ اختر نے اپنی جان کی بازی لگا کر اُسے بچایا تھا۔ ورنہ ابتک وہ جشیوں کے پیٹ میں پہونچکر ہضم ہونے کے بعد خون میں تبدیل ہو کر ان کی رگوں کے جال میں اُلجھکر رہ جاتی۔۔۔۔۔۔ اسی لئے اپنے محسن کی تلاش میں وہ گھر سے نکلی تھی لیکن بدقسمتی سے سانپ نے کاٹ لیا۔

سلطانہ نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ کیوں چھپائے وہ؟۔ کیا وہ کسی کی چوری کر رہی تھی؟۔ کیا محبت کرنا جرم ہے۔؟

کتاب کو اس نے بند کر دیا۔ ایک نظر چھت کو دیکھا اور اب زمین کو

اس طرح گھور رہی تھی جیسے مسمریزم کا عمل کر رہی ہو۔

وہ اُٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو ملنا شروع کر دیا۔ اب وہ کچھ سوچتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کے دماغ میں ایک ایسی اُلجھن ہے جس کو اختر کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں سمجھا سکتا۔

وہ صوفے پر ڈھیر سے گر پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ ٹھیک اُسوقت صوفے کے پیچھے والی کھڑکی سے ایک سفید لفافہ آکر اس کی گود میں گرا۔ وہ چونک پڑی۔ لفافہ کو اُٹھا کر اُس نے کھڑکی کیطرف دیکھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔

لفافہ چاک کرتے وقت اس نے کھڑکی کے قریب جاکر باہر دیکھا۔ اب بھی کوئی نظر نہ آیا۔

لفافہ کے اندر سے ایک سُرخ رنگ کا کاغذ نکلا جس پر لکھا تھا۔

"سلطانہ تمھاری عزت اور جان خطرے میں ہے۔ ہوشیار رہو"

"ایک گنہگار"

سلطانہ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ گنہگار کون ہے۔ اور اس کا مطلب کیا ہے۔؟

باب ۴۸

"غریبوں کا خون"

آج اصغر کے بال بچوں کا پیٹ پسلیوں سے دو دو انگل باہر تھا۔

وہ اپنے کپڑوں کو بار بار دیکھکر اتنا خوش تھے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی ساری مرادیں بر آگئیں ہیں۔ غریب کو اگر پیٹ بھر روٹی اور تن بھر کپڑا مل جائے تو وہ بیچارہ سمجھتا ہے کہ اسے سب کچھ مل گیا۔ لیکن امیر " " امیر کو چھوڑیئے۔ وہ تو اسی وقت خوش ہوتا ہے جب لاکھوں غریبوں کا خون ملوں اور فیکٹریوں کے ذریعہ نچوڑنے کے بعد وہ چاندی اور سونے کی کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی کر لیتا ہے۔ اصغر کے بچوں نے کھلونوں کو آج پہلی بار ہاتھ لگایا تھا۔ وہ اِن کھلونوں کو گود میں لئے لئے اُچک اُچک کر اِدھر اُدھر ہنستے پھر رہے تھے۔ اصغر اپنی بیوی کے پاس بیٹھا بچوں کو اس طرح خوشیاں مناتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو آنسو گرے۔ اپنی بیوی کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس نے کہا "شکر ہے اس پروردگار کا۔ جس نے ہمیں یہ دن دکھائے"

اگر دنیا میں انصاف کا بول بالا ہو جائے تو کیا ہر غریب کو یہ دن نصیب نہیں ہو سکتے۔ ؟؟؟

باب ۴۹

"دُوسری دنیا کا ٹکٹ"

اختر کی ماں کو بند گاڑی میں ہسپتال لایا جا چکا تھا۔ یہاں وہ ہوش میں آگئی تھی۔ اور اُس کا بخار بھی کچھ کم ہو گیا تھا۔

یہ پوچھنے کی بات نہیں کہ وہ اور اختر ایک دوسرے سے چمٹ کر کتنا روئے ہوں گے۔ اور بیچاری غریب بڑھیا کتنی خوش ہوئی ہوگی جس کو اختر کے مل جانے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔

ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ بڑی بی کو الگ کمرے میں رکھا جائے لیکن اختر کے کہنے سے اُنھوں نے اُن کو اختر ہی کے کمرے میں رہنے دیا۔

اختر کی غریب ماں بسجید کمزور ہو چکی تھی اب اس میں رکھا ہی کیا تھا۔ بس ہڈی اور چمڑہ رہ گیا تھا۔

وہ اختر سے زیادہ بات نہ کر سکی اسلئے کہ تھوڑی دیر بعد اس کا بخار پھر تیز ہو گیا تھا۔ اور اب وہ پڑی ہوئی بڑبڑا رہی تھی۔

پریشان حال اختر اس کے سرہانے بیٹھا رو رہا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

نرسیں اور ڈاکٹر بڑی بی کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ کبھی سر پر برف رکھتے کبھی حلق میں دوا ٹپکاتے۔ غرض ہر طرح بخار کو اتارنے کی کوشش کرتے۔ لیکن بڑی بی تھیں کہ دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹانے پر اڑی ہوئی تھیں۔

باب ۵

"ارے صاحب سولہ آنے لو"

یوسف اپنے کمرے میں گاؤ تکیہ سے ٹکا ہوا بیٹھا تھا حُقے کی نَے اسکے

منہ میں تھی۔ شہر کے چار چھٹے ہوئے غنڈے اس کے قریب بیٹھے بیڑی کے کش کھینچ رہے تھے۔

یوسف :۔ "تم لوگوں سے کچھ بنتا بناتا تو ہے نہیں۔ جب دیکھو روپیہ لینے چلے آتے ہو"

ایک غنڈا :۔ "اے صاحب اس دوزخ کو بھی تو آخر بھرنا ہے۔ روپیہ نہ لیں تو کام کیسے چلے"

دوسرا :۔ "جب وہ گھر ہی سے نہ نکلے تو ہم کیا کریں"

تیسرا :۔ "جس دن وہ ذرا بھی باہر آگئی بس اُسی دن سمجھ لو، ہمارا کام ہو گیا"

چوتھا :۔ "میاں کام ذرا سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔ اب آپ چاہو کہ ہم نقب لگا کر سلطانہ کو اٹھا لائیں تو یہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے"

پہلا :۔ (ہنسکر) "کیوں نہیں اگر میاں ہمیں بتا دیں کہ ہمارے جیل جانے کے بعد پانچ برس تک بال بچے فاقوں نہ مریں تو ہم یہ بھی کر سکتے ہیں"

دوسرا :۔ "اجی نقب تو کیا۔ بیسوں کیلئے تو۔ پیسوں کے لئے بھی کیا بال بچوں کیلئے تو ہم توپ کے اندر سے بھی اس کو کھینچ لائیں"

تیسرا :۔ "کریں کیا؟ بال بچوں کو بھوکا مرتے نہیں دیکھا جاتا۔ ورنہ آج ہم چوری کیوں کرتے۔ غنڈے کیوں کہلاتے۔ دو پیسے کیلئے اپنی جان خطرے میں ڈالکر دوسروں کیواسطے لڑکیاں کیوں بھگاتے پھرتے"

چوتھا :۔ "میاں آپ اطمینان رکھو۔ سب کام ٹھیک بن جائے گا۔ " "

بس آپ تو اسونت ہمارے سے " "

یوسف: (ہنس کر کچھ نوٹ دیتے ہوئے) لو۔" "مگر کام ہونا چاہیئے۔ ٹھیک....."

پھلا:۔ (مسکرا کر) ارے صاحب سولہ آنے لو۔"

باب ۱۵

"یکایک سلطانہ نے انگڑائی لی"

چودھویں کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ سیٹھ محمود کے وسیع باغ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب پریوں کا اکھاڑہ اُترنے ہی والا ہے۔ سرو کے سائے۔ سنگ مرمر کے حوض۔ فواروں کی مہین پھوار، رات رانی اور مدن کامنی کی مست خوشبو" " درختوں میں سے چھنتی ہوئی چاندنی، شبہ ہوتا تھا کہ یہیں کہیں کسی گھنی خوشبودار جھاڑی میں پریاں چھپی بیٹھی ہوں گی اور ٹھیک بارہ بجے گاتی بجاتی نکل پڑیں گی۔

لیکن بارہ سے پہلے ہی واقعی ایک حسن کی دیوی چمپا کے درخت کے پیچھے سے ہوتی ہوئی حوض کی طرف آ رہی تھی۔ یہ پری وری نہیں تھی۔ یہ تو وہی کیوپڈ کی ستائی ہوئی بیچاری سلطانہ تھی جو تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے میں مسہری پر پڑے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ روتے روتے نہ جانے کیا خیال آیا اور یہاں باغ میں آ کر حوض کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ بظاہر اس کی آنکھیں پانی کی لہروں پر چاند کو گھور رہی تھیں لیکن واقعہ تو

یہ ہے کہ وہ اسوقت کہیں اڑ رہی تھی ۔ مہین مہین پھوار نے اسکے بالوں پر لاتعداد موتی جما دیئے تھے ۔ " " باغ میں اُس کے آجانے سے اس دلفریب منظر کو چار چاند لگ گئے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی کمی پوری ہوگئی ہو ۔ " " لیکن باغ کی پتھروں والی روِش کے پیچھے سے چند بھیانک آنکھیں سلطانہ کو گھور رہی تھیں ۔ اور ابتو ٹھنگنے قد والے تین ڈھاٹا بند بدمعاش آہستہ آہستہ دبے پاؤں درختوں کی آڑ لیتے ہوئے چھپتے چھپاتے چلے آرہے تھے ۔ جب یہ سوچتے سوچتے چونک پڑتی تو وہ لوگ ٹھٹک کر وہیں آڑ میں ہو جاتے ۔ اور جوں ہی یہ گردن نیچی کرتے اپنے خیالوں کی دنیا میں گم ہو جاتی وہ تینوں پھر اپنی جگہ سے آگے سرکنے لگتے اور اُس کے قریب تر ہوتے جاتے ۔ ابتو ایک بدمعاش اس سے صرف چند گز کے فاصلہ پر رہ گیا تھا ۔ یکایک سلطانہ نے انگڑائی لی ۔ آہٹ پا کر وہ پلٹ کر دیکھنا ہی چاہتی تھی کہ اُس بدمعاش نے جلدی سے آگے بڑھکر اُس کے منھ پر کپڑا رکھدیا ۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ گئی ۔ اس آفت ناگہانی سے چھٹکارا پانے کے لیے اس غریب نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن بےسود ۔ چلاتی بھی تو کیسے منھ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا ۔

الغرض چشم زدن میں یہ تینوں بدمعاش اُسے اُٹھا کر باغ سے نیچے اُتر گئے ۔

باب ۵۲

"وعدہ کیجیے"

اب اختر بالکل اچھا تھا۔ آج اُس کی ماں کا بخار بھی اُتر گیا تھا۔ لیکن کمزوری زیادہ تھی اسوجہ سے دو تین روز کے لیئے یہ لوگ ہسپتال میں اور ٹھہر گئے تھے۔

آج اختر کی آنکھ جلدی ہی کھُل گئی تھی۔ منھ ہاتھ دھو کر وہ میدان کی ہری ہری دوب پر ٹہل رہا تھا۔ کہ پیچھے سے کسی نے کہا۔

"آداب عرض ہو اختر صاحب!"

اختر نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے وہی حضرت یوسف صاحب کھڑے تھے جن کی مہربانی سے اختر زخمی ہوا۔ دریا میں پھینکا گیا۔ وہ تو کہو ترائن کو ترس آگیا۔ جو اُس نے ایک دقیانوسی ڈونگے میں اسے پٹخ دیا۔ ورنہ ابتک تو یہ خدا گنج کی ہاٹ پہونچ لیا ہوتا۔ اختر کی نظر اسوقت یوسف کے چہرے پر تھی اور اسکا دماغ جلدی جلدی وہ تمام پچھلے واقعات یاد کر رہا تھا جن کی بدولت وہ اس اسپتال میں کئی دن سے پڑا تھا۔

یوسف (مسکرا کر) اختر صاحب میں آپ سے معافی مانگنے حاضر ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ اُس دن پہلے سے میں نشہ میں تھا۔ اُس کی دُھن میں کچھ ایسی حرکتیں کر گیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیئے تھیں۔ بعد میں میں کتنا پچھتایا آپکو کیا بتاؤں۔

خطا انسان ہی سے ہوتی ہے۔ اور صاف دل اُسے معاف بھی کر دیا کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میرا جرم اتنا بڑا ہے کہ میں آپ سے آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کر سکتا۔ میری گردن ندامت سے جھکی جا رہی ہے۔

اختر صاحب۔ میری خطا قابل معافی تو نہیں ہے لیکن ... لیکن مجھے آپ سے اُمید ہے اگر آپ نے مجھے معاف کر دیں گے تو میرے دل و دماغ سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ جائے گا۔ جس کے نیچے میں پسا جا رہا ہوں۔ سلطانہ سے بھی معافی مجھے مانگنی ہے۔ بہرحال اگر آپ لوگ میرا قصور سچے دل سے معاف کر دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ اختر صاحب کیا آپ اس گنہگار کو معاف کر سکیں گے"؟

اختر یوسف کے منہ سے اتنی باتیں سنکر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ ایک منٹ تک وہ زمین کو گھورتا رہا۔ کیا جواب دے۔؟ آخر کار اُس نے گردن اُٹھائی۔

اختر (مسکرا کر) یوسف صاحب آپ نے میری جان لینے میں تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہرحال جہانتک میرا تعلق ہے میں نے معاف کیا۔ لیکن ... ..."

یوسف۔ (اختر کا شانہ چھو کر) میں کس زبان سے آپکا شکریہ ادا کروں۔ (کچھ سوچکر) کوئی حرج نہ ہو تو کچھ عرض کروں"۔

اختر:۔ "فرمایئے"۔

یوسف:۔ سلطانہ اور آپ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں"۔؟

اختر نے یوسف کی طرف دیکھا۔

یوسف (مسکراکر) آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اب میں آپ دونوں کی اس محبت سے ناخوش نہیں ہوں"
اختر:۔ "آپ کا مطلب کیا ہے"؟
یوسف:۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میں آپکے لئے کتنا ہی کچھ کر جاؤں لیکن میری آنکھیں آپکے سامنے نیچی رہی ہیں گی"
اختر:۔ (مُسکراکر) کس قسم کی مدد آپ میری کرنا چاہتے ہیں"؟
یوسف:۔ "یہی کہ بس۔ دونوں کو ملادوں۔ یعنی۔ .. .. .. یعنی کہ شادی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ پرسوں میرے یہاں جلسہ ہونیوالا ہے۔ ہمشیرہ کی سالگرہ کے سلسلہ میں۔ آپ ضرور تشریف لایئے گا۔ اس عرصہ میں میں سلطانہ سے بھی مل لونگا۔ اگر وہ بھی مان گئیں۔ تو ممکن ہے کہ وہ بھی آجائیں۔ آپ سے ملاقات بھی ہوجائے گی اور۔ .. .. دیکھئے ضرور تشریف لایئےگا اختر صاحب"
اختر:۔ (مسکراتے ہوئے) کوشش کروں گا"
یوسف:۔ اگر آپ نہیں آئے تو میں یہی سمجھونگا کہ آپنے سچے دل سے مجھے معاف نہیں کیا۔ وعدہ کیجیے"
الغرض یوسف نے اختر سے جلسے میں شریک ہونے کا پکا وعدہ لے ہی لیا۔ اختر نے بھی سوچا۔ چلو اس بہانے سے سلطانہ سے ملاقات ہوجائے گی"
ان بیچارے کو کیا خبر کہ یوسف صاحب اس کو جلسے میں کسواسطے لارہے ہیں۔

باب ۵۳

"بنگلے میں آگ"

دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے بنگلے سے کسی عورت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ چھریاں دکھا دکھا کر اُسے خاموش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن سلطانہ کو اب اپنی جان کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی سے تنگ آ چکی تھی تو بھلا ان بدمعاشوں کی چھریوں سے کیا ڈرتی۔ اس کے ہاتھ پیر رسی سے کسے جا رہے تھے اور وہ تڑپ تڑپ کر اپنے کو چھڑانے کی بیکار کوشش کر رہی تھی۔ یکایک دروازے کو کسی نے زور سے ٹھونکا۔ اس میں سے ایک بدمعاش نے پہلے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ آنے والا کون ہے۔ پھر ایک سوکھا سا قہقہہ لگا کر دروازہ کھول دیا۔ اور یوسف چہرے پر ڈھاٹا باندھے ہوئے اندر داخل ہوا۔

ایک بدمعاش (ہنس کر) شکار حاضر ہے۔

یوسف نے دو روپوں کی تھیلی بدمعاشوں کو دیتے ہوئے آواز بنا کر) بس اب تم لوگ جاؤ۔ میں اس کو سمجھ لوں گا۔

دوسرا بدمعاش :۔ پھر نہ کہئے گا کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔

تیسرا بدمعاش (جاتے ہوئے ہنس کر) اچھا خدا حافظ۔ اب مزے اڑائیے آپ تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چوتھا :- "چلو چلو۔ شیر گارڈ پر ہے"
ان چاروں کے جانے کے بعد یوسف نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔
سلطانہ (گھبرا کر) "تم کون ہو؟"
یوسف :- "(آواز بنا کر) خاموش"
یہ کہکر اُس نے بیچاری نہد ھی بندھائی سلطانہ (جو ایک ٹوٹے ہوئے پلنگ پر پڑی تھی) کی آنکھوں پر احتیاطاً اپنا رومال نکال کر پٹی باندھ دی اور کرخت لہجہ میں بولا۔ اُف۔ اوہ، کتنے کپڑے پہن رکھے ہیں تو نے۔ مجھی کو اُتارنا پڑیں گے یہ سب! اچھا۔"
سلطانہ :- "الگ ہو .. .. دور ہٹ۔ میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا کمبخت"
یوسف :- "ذرا ٹھہر جا"
سلطانہ :- "خدا کیواسطے کیا کرتا ہے منحوس .. .. .. کون ہے تو، کمینے .. .. .. میرے کپڑے کیوں اُتارے لیتا ہے" ..
او خدا یہ کیا ہوتا ہے"
یوسف :- "ذرا چپ کی تو رہ"
سلطانہ :- "نہیں نہیں .. .. .. ارے نہیں .. .. .. مجھے ننگا کئے ڈالتا ہے او منحوس .. .. .. دور ہو .. .. خدایا میری بچالے۔ بچالے۔ میری عزت"
یوسف (ہنسکر) اللہ میاں مجھ سے ڈرتے ہیں۔ یہاں نہیں آئیں گے۔

دفعتاً دھڑام سے ایک آواز ہوئی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے کود کر نقاب پوش ہاتھ میں پستول لیئے یوسف کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اسپتال میں سیٹھ محمود کو سلطانہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے (کھڑکی سے سر نکال کر) دیکھا تھا۔ جس نے اصغر کو اسپتال سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جس نے کھڑکی سے پرچہ پھینک کر سلطانہ کو اس کے دشمنوں سے خبردار کیا تھا۔

"ہاتھ اونچے کرو" نقاب پوش ڈپٹ کر بولا۔ ورنہ یاد رکھو جان سے ہاتھ دھو بیٹھوگے"

یوسف نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اونچے کر لیئے۔ اور ڈرتے ڈرتے پوچھا "تم کون ہو"!

نقاب پوش نے اس کے جواب میں سیٹی بجائی۔ فوراً ہی ایک ڈھاٹا بند اسی کھڑکی سے کود کر اندر آیا۔

نقاب پوش یہ دیکھو اس لڑکی کو کھول لو۔ اور موٹر میں بٹھا کر اس کے مکان پر چھوڑ آؤ۔ لیکن یاد رکھو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دینا۔ اور اسے چھوڑ کر فوراً واپس چلے آنا"

جب سلطانہ کے ہاتھ پیر کھول کر وہ ڈھاٹا بند اسے لیکر باہر چلا گیا تو نقاب پوش یوسف کی طرف مخاطب ہوا۔ اب تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے"

یوسف خاموش رہا۔

نقاب پوش نے پھر سیٹی بجائی اور ایک دوسرا ڈھاٹا بند آدمی اندر آیا۔

نقاب پوش: "یہ رسی جو پڑی ہوئی ہے۔ اس سے ذرا کس تو ڈالو انھیں۔ اور یہ چھت میں جو کڑا لٹک رہا ہے۔ بس اسی میں انھیں لٹکا دینا۔ اسکے بعد بنگلے میں آگ ۔۔۔ سمجھے"

باب ۵۴

"کون ؟ ۔۔۔ اصغر؟"

نرائن دریا کے کنارے کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ اصغر اسی گاؤں کی طرف جارہا تھا۔ نرائن نے اگر آج بھی نہ بتایا کہ اختر کو اس نے کہاں چھوڑا تھا تو پھر اس کی (نرائن) کی خیر نہیں۔ وہ جوڑ کا بچہ آنا پڑے گا کہ اس کی ہڈیاں اور پسلیاں بھی برابر ہو جائیں گی اور اگر سچ سچ بتا دیا۔ اس نے تو پھر تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کو انعام دیا جائے گا۔ پانچ روپے میں تو اس کی بتیسی نکل آئے گی۔ پھر نہ جانے کیا کیا بکواس کرنے لگے گا بڑا پاتونی ہے کمبخت۔ زبان بھی ٹیڑھی ہے اس کی۔ ایک سانس میں خبر نہیں کیا کیا کہہ جاتا ہے۔

اصغر مسکرادیا۔ دریا کے کنارے اس قسم کی باتیں اپنے

دل سے وہ کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جوں ہی وہ دریا کے ساتھ مڑا اس کی نظر سامنے والے جلتے ہوئے بنگلے پر پڑی۔ جب یہ بنگلے کے قریب پہونچا تو کھلے ہوئے دروازے سے اُس نے دیکھا کہ کوئی شخص بیکسی کے عالم میں شعلوں سے بُری طرح لڑ رہا ہے۔ بندھے ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ دھوئیں کی وجہ سے اصغر یوسف کو پہچان نہ سکا۔ ورنہ اب ان کا پہچان لینا کوئی مشکل نہ تھا۔ کیونکہ اس کا ڈھاٹا وہاٹا سب کھل کھلا گیا تھا۔

کرسے کے قریب کی رسّی جل جانے کی وجہ سے یوسف زمین پر گر پڑا تھا۔ جہاں پڑا پڑا وہ آگ کی بڑھتی فوج کو مایوس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اصغر لپک کر بجلی کی طرح کمرے میں گھس گیا اور دو منٹ بعد شعلوں کی لپٹ سے بچتا بچاتا وہ یوسف کو باہر نکال لایا تھا۔

"اوہو یوسف صاحب ہیں"

اصغر نے مسکراتے ہوئے کہا "کہئے یہاں کیسے آن پھنسے"؟

یوسف نیم بیہوش سا ہو رہا تھا بولا "کون ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اصغر"؟

"جی ہاں میرے محسن" ۔ ۔ بندہ اصغر ہی ہے"

"شکریہ بھئی، اچھا تم جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا"

"بہتر ہے لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ قصہ کیا تھا"؟

"نہ جانے کون سُور کا بچہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تم جاؤ۔

پھر کسی وقت ملنا تو بتاؤں گا۔ یہ قصّہ۔"

اصغر نے زور کا ایک سوکھا سا ٹھٹھہ لگایا اور سیٹی بجاتا ہوا چل دیا۔

باب ۵۵

"وہم اور کون؟"

اختر کو یوسف نے اپنے گھر کا پتہ بتا ہی دیا تھا۔ چنانچہ اختر اپنے وعدے کے مطابق ہسپتال سے یوسف کے مکان پر جا پہونچا۔ جلسے میں شرکت کرنے اور پھر یوسف جیسے شریف آدمی کے یہاں تو وہ کیا آتا۔ لیکن سلطانہ سے ملاقات کا خیال اُسے یہاں کھینچ لایا تھا۔

اختر ایک سیدھا سچا انسان تھا۔ اس کو سان وگمان بھی نہ تھا کہ یوسف اس سے پھر کوئی چال چلنا چاہتا ہے۔

یوسف نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اس قدر خاطر مدارات کہ بس بچھا جارہا تھا۔

یہاں آکر اختر کو معلوم ہوا کہ جلسہ تو کسی وجہ سے دو تین روز کو ملتوی ہو گیا ہے (جس کی اطلاع یوسف اختر کو نہ کر سکا تھا۔) لیکن اس وقت وہ بغیر کھانا کھائے نہیں جا سکتا کیونکہ یوسف نے خاص طور سے کئی چیزیں

اس کے لئے پکوائی ہیں اور سلطانہ کو بھی بلا بھیجا ہے۔ شاید وہ بھی آتی ہی ہوں گی"۔
سلطانہ کے آنے کی خبر سنکر اختر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ خیالوں
کی دنیا میں گم سم ہو کر بیٹھ گیا۔
بڑی دیر ہو گئی اور سلطانہ نہ آنا تھی نہ آئی۔ یوسف نے تو اختر کو دھوکہ دینے
کیلئے جھوٹ بولا تھا کہ اُس نے سلطانہ کو بلایا ہے۔
بہر حال دستر خوان بچھا اور بڑا پُر تکلف کھانا چنا گیا۔ یوسف اور
اختر کے سوا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ کھانے پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔
لیکن اختر کے کان آہٹ پر لگے ہوئے تھے کیوں؟ یہ آپ جانتے ہیں کھانے کے بعد
یوسف دوسرے کمرے میں (جو لب سڑک تھا) پان لینے چلا گیا۔ میز کی دراز
کھول کر اس نے چھوٹی سی قینچی اور ایک موٹا سا سفید بال نکالا اور اس
بال کو مہین مہین کر کے مسکراتے ہوئے ایک موٹے سے پان میں رکھکر لونگ
لگا دی۔ قینچی کو واپس دراز میں رکھا۔ پھر تھالی میں دو پان رکھکر (ایک
بڑا لونگ والا) وہ آئینہ کے سامنے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ کھڑکی کی
طرف کوئی چیز ہلتی نظر آئی۔ یوسف گھبرا گیا۔ "... کون ہے ...؟ ...
پھر خود ہی مسکرا دیا۔ وہم اور ... کون"؟
ایک منٹ بعد یوسف پانوں کی تھالی لئے ہوئے اختر کے پاس
پہونچا۔
"لیجئے اختر صاحب - پان ملاحظہ فرمائیے"۔
قبل اس کے کہ اختر چھوٹا پان اُٹھائے یوسف اس چھوٹے پان کو

اپنے منہ میں رکھ چکا تھا۔ اب تھالی میں یہ لونگ والا بڑا پان ہی رہ گیا تھا۔ جسمیں یوسف نے شیر کی مونچھ کا بال کتر کے ڈالا تھا۔ یہ ایک خطرناک سلو پائزن تھا کہ سال بھر کے اندر اندر انسان ختم ہو جاتا ہے۔

الغرض اختر نے اس زہریلے پان کو اٹھا لیا۔ لونگ نکالی اور چاہتا تھا کہ منہ میں رکھ لے کہ دفعتاً اس کمرے کا پردہ ہٹا جہاں سے یوسف پان لینے گیا تھا) اور کسی نے زور سے چلا کر کہا "خبردار۔ پان ہرگز نہ کھانا"۔

یوسف اور اختر دونوں کی نظریں اسطرف اٹھ گئیں۔ وہی نقاب پوش جس نے سلطانہ کو یوسف سے بچایا تھا پستول ہاتھ میں لئے کھڑا چیخ رہا تھا "اس پان کو سوائے یوسف صاحب کے اور کوئی نہیں کھا سکتا"۔

یوسف گھبرا گیا اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔

"خبردار۔ ہاتھ اٹھاؤ"۔

پستول کی نال اپنی طرف دیکھکر یوسف نے جلدی سے اپنے ہاتھ اونچے کئے۔

نقاب پوش (زور سے) اختر صاحب۔ پان کو ان کے منہ میں دبا دیجئے۔۔ جلدی۔"

اختر بیچارہ ہکا بکا ہو رہا تھا۔ بہرحال اس کو حکم کی تعمیل کرنا پڑی پان کو وہ یوسف کے منہ کے قریب لے گیا۔

نقاب پوش (یوسف کو گھیرتے ہوئے) "منہ کھولو۔ لیکن یوسف کا منہ بند تھا۔

نقاب پوش (پستول ہلا کر دندناتے ہوئے) منہ کھولو۔ منہ کھولو ورنہ؟"

یوسف نے فوراً منہ کھول دیا۔ اور اختر نے پان اسکے دانتوں کے سپرد کی

"چباؤ" نقاب پوش زور سے گرجا" چباؤ اور جلدی نگل جاؤ"

القصہ بیچارے یوسف صاحب کو پان کسی نہ کسی طرح حلق کے نیچے اُتارنا

ہی پڑا۔

نقاب پوش (قہقہہ لگاکر) اچھا اختر صاحب۔ اب آپ یہاں سے رفو چکر ہو جائیے

اور خبردار اس شیطان سے اب کبھی نہ ملئے گا۔ یہ پان میں زہر دے رہا تھا آپ کو۔

اختر (یوسف کو گھور کر نقاب پوش سے) شکریہ، کیا میں پوچھ سکتا ہوں..."

نقاب پوش (بات کاٹ کر) نہیں۔ (اشارہ کرکے) بس آپ کا وہ راستہ ہے"

جب اختر چلا گیا تو نقاب پوش نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

"اپنی بندوق کا خود شکار...... ہاہاہا... ہی ہی"

یہ کہکر وہ پیچھے ہٹا اور کھڑکی کے باہر چھلانگ لگا کر یہ جا وہ جا۔"

باب ۵۶

"وہ سوچنے لگا"

نقاب پوش پھونس کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بیٹھا ہوا اس خط کو دوبارہ پڑھ رہا تھا جو اُس نے ابھی ابھی لکھکر تیار کیا تھا۔

"نقاب پوش کون ہے۔ اب اس کو سب پتہ لگ جائے گا" اس نے
مسکرا کر دل میں کہا اور خط کو لفافہ میں بند کرکے لفافہ پر "سلطانہ" لکھدیا۔
نفیس کے ہاتھوں بھیجوں یا خود دے جاؤں۔ وہ سوچنے لگا۔ نہیں میں
خود ہی جاکر اس کی کھڑکی میں پھینک آؤں گا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ جھونپڑی سے
جھانک کر باہر دیکھا اور کسی کو جاتا دیکھ کر جلدی سے اندر ہوگیا۔ دو منٹ
خاموش کھڑے رہنے کے بعد پھر جھانک کر دیکھا اور جب اطمینان ہوگیا تو
جھونپڑی کے باہر آکر آہستہ سے دروازے کو بند کیا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا
ایک طرف کو چل دیا۔

باب ۵

"یہ گل چھرے"

خود کا تیار کردہ زہر یوسف کے پیٹ میں جا چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ
ایک سال کے اندر گھل گھل کے وہ ختم ہو جائے گا کیونکہ شیر کی مونچھ اپنا اثر
دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ گڑھا کھودا تھا کمبخت دوسرے کیلئے اور گر پڑے
خود ہی اوندھے منہ آکے تھا"

"مرنا تو اب ہے۔ لیکن اس کمبخت نقاب پوش کو مزا چکھا کے رہوں گا۔ بیچ بیچ
میں کون ٹپک پڑا اُلو کا پٹھا۔" لیکن کیا ایک سال بعد میرا اڈھک نہ

قبرستان ہوگا ——— اُف، یہ خیال مجھے کھائے جاتا ہے۔ مجھے کسی بڑے ڈاکٹر سے مشورہ لینا چاہیئے۔ لیکن شیر کی مونچھ ——— یہ کمبخت مجھے جینے نہیں دے گی۔ یہ تو اُس سوئی سے بھی زیادہ خطرناک ہے جو انسان کے جسم میں ٹوٹ کر رہ جائے۔ خیر کچھ بھی ہو۔ مجھے ڈاکٹر سے تو ملنا چاہیئے۔ شاید کچھ ہو سکے۔ بڑا مشہور ہے وہ۔ امریکہ والے بھی مانتے ہیں اسکو۔ اسوقت تو مل جائے گا گھر پر۔ چلو ہو آؤں۔ دیکھو کیا کہتا ہے وہ۔ حسن آرا کو یہ روپے بھی تو دینا ہیں۔ بس روپے دیتا ہوا اُس کو سیدھا ڈاکٹر کے یہاں ہی جاؤں گا۔

الغرض یوسف حسن آرا کے مکان پر پہونچا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند دیکھکر اُس نے اُسے کھٹکھٹانا چاہا۔ لیکن جوں ہی اُس نے دروازے پر ہاتھ رکھا وہ کھل گیا۔ اور جیسے ہی کھلا۔ یوسف کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مارے غصے کے وہ بید کی طرح کانپنے لگا۔

پستول نکال کر وہ حقارت سے کہنا " او بیسوا۔ رنڈی۔ فاحشہ۔ او بیوفا عورت۔ . . . . . . میری غیر موجودگی میں یہ گل چھرے"۔

حسن آرا سیٹھ ہزاری لال کی گود سے اتر کر بری طرح کانپ رہی تھی۔ ادھر سیٹھ جی کا تو عجیب حال تھا۔ وہ سانبھر کی طرح ایک طرف دروازے کے پردے میں منھ دیئے کھڑے تھے اور ان کا سارا جسم پردے کے باہر تھا گویا پردے میں صرف منھ چھپا کر سیٹھ جی اپنے کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔

یوسف طیش میں بس بکے جا رہا تھا۔ نہ جانے کیا کیا۔ اور جب اُس نے کہا " چھنال تو سچ مچ رنڈی ہے " تو حسن آرا مسکرا کر بولی " یہ تو دنیا جانتی ہے"

اسکا اتنا سُننا تھا کہ یوسف نے تڑ سے فیر کیا۔ اور حسن آرا اپنا سینہ پکڑ کر ایک دردناک آہ کیساتھ زمین پر آرہی۔ سیٹھ ہزاری لال ایسے زور سے اُچک پڑے جیسے گولی انھیں کے لگی ہو۔

اب ہزاری لال کی باری تھی یوسف کے دوسرے فیر میں وہ بھی اوندھے منھ قریب کی کرسی پر جا پڑے۔

دو خون کرنے کے بعد یوسف پر بری طرح خون چڑھ گیا اور پستول کو ہاتھ میں لیئے وہ بھوکے شیر کی طرح باہر نکل گیا۔

باب ۵۸

"اب میں چوری سے توبہ کر چکا ہوں"

جونہی پستول ہاتھ میں لیئے یوسف حسن آرا کے گھر سے باہر آیا اس کی نظر گلی میں کسی کالی چیز پر پڑی جو دیوار سے ملی ہوئی سرک رہی تھی۔ غور سے دیکھنے کے بعد یوسف نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی کمبخت نقاب پوش تھا جس نے سلطانہ کو اسکے پھندے سے چھڑا کر اُس کو (یوسف کو) الٹا لٹکانے کے بعد بنگلے میں آگ لگوا دی تھی۔ یہ وہی منحوس شخص تھا جس نے اختر کو پان کھانے سے روکا تھا اور پھر وہ زہر کا بجھا ہوا پان اُسی کے ہاتھ اُس کے منھ میں ٹھسوا دیا تھا۔ یوسف نے عجیب قسم کی ایک خوشی محسوس کی۔ یکایک اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بدلہ

لینے کا اس سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا۔ کہیں شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اختر اور سلطانہ کے رفیق۔ اب اپنے کئے کی سزا بھگت۔ یوسف نے جھپٹ کر نقاب پوش پر یکے بعد دیگرے دو فیر کر ڈالے۔ بیچارے نقاب پوش کا فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اور اب وہ غریب زمین پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ آخری الفاظ جو اس کے منہ سے نکلے یہ تھے "دھوکے باز اسکا بدلہ بھی تجھے جلد ہی مل جائیگا۔

چاروں طرف سے شور و غل کی آواز سنکر یوسف گھبرا گیا۔ ہر طرف سے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ گویا اس گلی میں وہ بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے تین خون کئے تھے۔ اب وہ کیا بچ سکتا تھا۔ پولیس۔!!! پھانسی کا تختہ۔!!! اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے پستول میں ایک گولی اور بچی تھی۔ نہیں اب دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی تھی۔ اور شیر کی مونچھ کا بال بھی تو وہ کھا چکا ہے۔ گویا اس کی زندگی تو اب ختم ہو ہی چکی ہے۔ کیا وہ پھانسی کے تختہ پر چڑھنا پسند کریگا۔ نہیں ہرگز نہیں پستول کو اسنے اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔ آنکھیں بند کیں۔ دانت بھیچے اور لبلبی دبا دی۔

اب یوسف کی لاش بھی نقاب پوش کی لاش کے قریب پڑی ہوئی تڑپ رہی تھی۔

مجمع کو چیرتا پھاڑتا اصغر بھی کہیں سے آپہونچا اور جیسے ہی مردہ نقاب پوش کی نقاب اُسنے اسکے چہرے پر سے ہٹائی۔ اصغر کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔ "کون"؟ دلاور"

اصغر نے اپنی اُنگلی دانتوں میں لے لی۔ ہائیں یہ تو مر چکا تھا یہ تو بقول

سلطانہ کے آدم خوروں کا نوالہ ہو چکا تھا۔ اُس نے جھک کر اُسے پھر دیکھا۔ دلاور تھا ـــــ دلاور ـــــ اسمیں کوئی شبہہ کی گنجائش نہ تھی۔ ایک سفید سا کاغذ اسکی جیب سے آدھا نکلا ہوا تھا۔ اصغر نے اُسے گھسیٹ کر دیکھا تو یہ سلطانہ کے نام کا خط تھا۔ (جس کو دلاور سلطانہ کے کمرے کی کھڑکی میں پھینکنے جارہا تھا) اصغر نے اس خط کو اپنی جیب میں رکھ لیا اور لوگوں کو چیختے چلاتے چھوڑ کر وہاں سے چلدیا۔ سیدھا ایک پارک میں پہونچا۔ ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ دلاور والے خط کو جیب سے نکالا۔ دیکھوں اسمیں اُس نے لکھا کیا ہے۔ مگر نہیں۔ کسی کا خط پڑھنا چوری ہے اور اب میں چوری سے توبہ کر چکا ہوں۔" وہ خط کو جیب میں رکھکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس کو لیجا کر سلطانہ کو دیگا۔ اسے کیا خبر کہ سلطانہ کچھ اور ہی سوچ چکی ہے۔ کیا وہ اس خط کو پڑھ سکے گی۔

باب ۵۹

"وہ تنگ آگئی تھی"

سلطانہ کو اب اختر سے ملنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ اسکا چاہنے والا دریا کی تہ میں پڑا سو رہا ہے۔

سلطانہ کا دل کسی کی فرقت اور اپنی بدنامی کی وجہ سے چکنا چور ہو چکا تھا۔

آنسوؤں کی اس وادی میں اس دنیا میں ایک ایک لمحہ اُس کے لئے سال بھر سے کم نہ تھا۔
وہ تنگ آگئی تھی۔ ... ... تنگ آگئی تھی ... ... اپنی زندگی سے۔

آج اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اندھیرا ہوتے ہی اپنے باغ کی پشت والی ندی میں ڈوب کر وہ اس دماغی کوفت سے کسی طرح اپنا پیچھا چھڑائے گی۔ اب اندھیرا ہو چلا تھا۔ اپنے والدین کے نام آخری خط لکھنے کے بعد اسے اپنے تکیہ کے نیچے رکھکر وہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ ندی کی طرف چلی جا رہی تھی۔

باب ۶۰

"کہاں تھے آپ؟"

اختر اپنی ماں کو لیکر آج ہسپتال سے گھر آگیا تھا۔ یہ اسوقت بازار سے کچھ لینے کیلئے آیا تھا کہ دور سے شور و غل کی آوازیں سنکر یہ اسطرف بڑھا۔ آخر قصہ کیا ہے؟ بیچ میں ایک تنگ سی گلی تھی۔ اختر تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر زور سے اُس کی ٹکر ہوئی۔

"دیکھکر نہیں چلتے آپ" کسی نے کہا۔

"دونوں ٹھٹک گئے"

"اختر صاحب؟ ——— آپ ہیں؟ بھئی خدا کی قسم" اصغر کے منہ سے نکلا۔
اصغر خوشی کے مارے بُری طرح اختر سے لپٹ گیا۔ "میں نے آپ کو سارے میں ڈھونڈ لیا۔

کہاں کہاں کے کنوؤں میں میں نے بانس نہیں ڈالے آپکے لیے۔ مکان پر تو آپ کے تالا پڑا رہے

خیر۔ خدا کا شکر ہے آپ زندہ ہیں۔ مجھے یقین تھا۔ کہاں تھے آپ"؟

اختر نے اصغر کو گھور کر دیکھا اس سے پہلے اختر نے اسے صرف دو مرتبہ دیکھا

تھا۔ پہلی دفعہ دلاور کے ساتھ تھیٹر میں اور دوسری مرتبہ یوسف کے ڈیرے میں۔

اصغر سمجھ گیا۔ اُسنے کہا۔ "آپ میری اس بے تکلفی پر دل ہی دل میں ہنس رہے

ہوں گے۔ یہ ناچیز۔ نام اصغر ہے۔ آپ کی سلطانہ کو یوسف صاحب کے پھندے سے اُس دن

اسی خاکسار نے چھڑایا تھا۔ سلطانہ سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو ڈھونڈھ کے

رہوں گا"۔

اختر "وہ اچھی تو ہیں وہ"؟

اصغر "بالکل اچھی ہیں مگر آپ کیلیے پریشان...... "

اختر (ٹھنڈی سانس لیکر) ہونھ....... "یہ ادھر گڑ بڑ کیسی ہو رہی ہے"؟

اصغر۔ اجی کچھ نہیں۔ آپ تو میرے ساتھ آیئے۔ سب بتا دوں گا میں آپ کو۔

پہلے آپ تو یہ بتایئے کہ آپ تھے کہاں؟ اس کے بعد آپ کے دشمن جان یوسف صاحب

کا سارا قصہ سناؤں گا آپ کو۔ یہ گڑ بڑ بھی اسی سلسلہ میں ہے۔ یوسف صاحب نے

دلاور کو مار کر خودکشی کر لی ہے"۔

اختر "کیا؟ —— یوسف نے خودکشی کر لی۔؟ اور دلاور کو مار کے۔؟ کون دلاور"؟

اصغر:۔ وہی دلاور جس کو حبشی کھا گئے تھے"۔؟

اختر "کیا کہتے ہو"؟

اصغر "میں سچ عرض کر رہا ہوں۔ یہ خط اس کی جیب سے نکلا ہے شاید اس میں اسکے متعلق

کچھ تفصیل ہو۔ بہرحال یہ سلطانہ کے نام کا ہے۔ اسکو وہی کھولیں گی (اختر کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے) ہاں اب آپ اپنا قصہ کہیئے "؟

اختر ایک منٹ تک ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ اسکے بعد مختصراً اُس نے ران میں گولی لگنے کے بعد سے اپنی کہانی اصغر کو سنا دی "

اصغر کو خود پر بڑا غصہ آیا کہ ایک ہی اسپتال میں ہوکر یہ اختر کا پتہ نہ لگا سکا۔

اصغر: " اسوقت میں آپکو سلطانہ کے یہاں لیئے جا رہا ہوں۔ وہاں چل کر ذرا دلاور کے اس خط کو بھی سن لیں گے۔ کوئی کام تو نہیں ہے آپ کو "؟

اختر: " نہیں کوئی خاص کام تو نہیں ہے۔ لیکن ...... "

اصغر: " لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس چلیئے۔ وہ انتہائی پریشان ہیں۔ آج خوش ہو جائیں گی۔ آیئے۔ مرحوم یوسف کی حرکتیں بھی سنا دوں گا۔ آپ کو راستے میں۔

باب ۶۱

" رانی گھاٹ "

ندی کے کنارے والی ٹھنڈی سڑک کو پار کر کے سلطانہ " رانی گھاٹ " پر پہونچی۔ اب وہ گھاٹ کی سیڑھیاں اترتی چلی جا رہی تھی۔ رکتے ہوئے صاف و شفاف پانی میں اب وہ اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ اس جگہ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔

"بس یہیں سے کود پڑوں۔ نہیں وہ سیڑھیاں اور ..." " ..." "کھٹ، کھٹ، بس اب ٹھیک رہے" آنکھیں نکال کر اس نے پانی کو دیکھا۔

"مجھے جاگتا چھوڑ کر اتنی جلدی سو گئے تم ——— اس پانی میں ——— جاؤ اب میں بھی منہ موڑ کر سو جاؤں گی۔ وہ عجیب طرح سے مسکرائی۔ نہیں نہیں، خفا نہ ہو۔ میں سوؤنگی نہیں ——میں آ رہی ہوں تمہیں جگانے سمجھے ———"

سلطانہ نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ایک نظر آسمان پر ڈالی۔ زور سے ہنسی اور پیر باندھکر ندی میں کود پڑی۔

زور سے دھماکے کی آواز ہوئی ... ... لیکن دو سکنڈ بعد ایک دھماکہ اور ہوا۔

اصغر راج گھاٹ پر کھڑا ہوا آنکھیں پھاڑ کر ندی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اصغر اور اختر دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ اُنھوں نے ایک عورت کو پانی میں کودتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ اس کو پہچان نہ سکے تھے۔ اندھیرے میں صرف اُنھوں نے اتنا دیکھا تھا کہ وہ ساری باندھے ہوئے تھی۔ اختر نے فوراً پانی میں چھلانگ لگائی لیکن چونکہ اصغر کو تیرنا نہیں آتا تھا اس لئے گھاٹ پر گھبرایا ہوا کھڑا وہ پانی کو گھور رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اختر اور وہ عورت دونوں ڈوب رہے ہیں۔ اصغر سے نہ رہا گیا۔ کوٹ اتار کر سیڑھیوں پر پھینکا اور بغیر سوچے سمجھے دھڑام سے پانی میں کود پڑا۔

بڑی دیر تک پانی میں موت اور زندگی کی لڑائی ہوتی رہی۔ القصہ جب اختر سلطانہ کو گود میں لیے ہوئے پانی سے نکلکر گھاٹ پر آیا تو اصغر وہاں موجود نہ تھا اسکے بجائے اسکا کوٹ سیڑھیوں پر پڑا تھا۔ سلطانہ بالکل بیہوش تھی۔ اختر اس گڑبڑ میں اصغر کو جیسے بھول ہی گیا۔ سلطانہ کو گھاٹ کے چبوترے پر لٹاکے وہ اس کے پیٹ سے پانی نکالکر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ لیکن وہ ہوش میں نہیں آئی۔ اب وہ کیا کرے۔ اسے فوراً اسکے گھر پہونچانا چاہیئے۔ اب ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔

اسوقت اسے اصغر کا خیال آیا۔ ہیں اصغر کہاں گیا۔؟ اور یہ کیا پڑا ہے؟۔ کوٹ؟ ــــ اصغر کا کوٹ ہے یہ تو۔؟ وہ کہیں پانی میں تو نہیں کود پڑا۔؟ اختر نے دور تک پانی کو گھورا۔ تاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں پانی بالکل ساکت تھا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا اصغر۔ کہیں گیا ہوگا۔ مگر کہاں؟ اور کوٹ اُتار کر؟۔ خیر وہ تو آجائے گا...... اسوقت سلطانہ کو میڈیکل ہلپ کی سخت ضرورت ہے۔ اختر نے سلطانہ کو فوراً گود میں اُٹھا لیا اور سیٹھ محمود کی طرف چلا۔

باب ۶۲

"مجھے معاف کردو"

دوسرے دن صبحکو اصغر کی لاش ندی میں تیرتی ہوئی ملی۔ اور اسکا کوٹ رات گھاٹ کی سیڑھیوں پر پڑا تھا جسمیں سے ایک سفید لفافہ جسپر "سلطانہ" لکھا ہوا تھا۔ یہ وہی لفافہ تھا جو اصغر نے دلاور کی جیب سے نکالا تھا۔ بیچارہ اصغر! سلطانہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دلاور والے خط کو چاک کرکے پڑھنا شروع کیا۔

بہن سلطانہ" ـــــ نقاب پوش کے متعلق تم نہ جانے کیا کیا سوچ رہی ہوگی یہی کہ یہ ہے کون ؟ اسکو کیا پڑی جو میری اسطرح مدد کرتا پھرتا ہے ؟ تمھیں کیا خبر کہ یہ وہی بدکار دلاور ہی جو اپنی کم عقلی کیوجہ سے ایک دن تمھارے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ بہن سلطانہ میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ ہاتھ جوڑکر معافی مانگتا ہوں ـــــ مجھے معاف کردو۔ خدا سے تو معافی مانگ چکا ہوں لیکن تم جبتک معاف نہ کروگی خدا کبھی معاف نہیں کرسکتا میں جانتا ہوں تم کہتی ہوگی۔ دلاور نے یہ پلٹا کیسے کھایا۔ تمھیں اسوقت سخت تعجب ہو رہا ہوگا کہ بھلا آدم خوروں کے پیٹ سے دلاور زندہ ہوکر کیسے نکل آیا۔ تم لوگ تو سب کے سب مجھے مردہ ہی سمجھ رہے ہو۔ بہرحال سنو میرا قصہ۔

جب اُن حبشیوں نے میرے کپڑے اُتار کر سر سے اونچا اُٹھا لیا اور کڑھاؤ کے قریب لے گئے تو میں نے خدائے بزرگ و برتر سے گڑگڑا کے دعا مانگی اور وعدہ کیا کہ اگر اسوقت تو نے مجھے بچا لے تو میں نہ صرف اپنی بری عادتوں کو چھوڑ دوں گا بلکہ اُن لوگوں کی مدد کرتا رہوں گا جو تکلیف میں ہوں۔ میں جانتا تھا کہ یہ عذاب تمھاری بددعا کا نتیجہ ہے۔ اللہ نے میری سن لی ـــــ ادھر وہ لوگ تم دونوں کو کسی دوسری طرف لے گئے ادھر اس خوفناک بدڈھنگے حبشی نے نہ جانے کیا سوچ سمجھکر مجھے زمین پر ٹپک دیا۔ اور میری جگہ میرے ایک دوسرے ساتھی نظیر کو (جو مجھ سے زیادہ تگڑا تھا۔) اُٹھاکر کڑھاؤ میں پھینکدیا۔ گویا اس دن میری باری ٹل گئی تھی۔ پھر اُنھوں نے مجھے ایک جھوپڑی میں بند کردیا۔ جب رات کو یہ لوگ تاڑی پی پی کر بیہوش ہوگئے تو میں بھی وہاں سے کسی طرح نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد سے تمھاری اور اختر کی کچھ یوں ہی سی خدمت کرکے گناہوں کی تلافی کرنے کی کوشش کررہا ہوں لیکن

جبتک تم لوگ دجن کی بدنامی اور مصیبت کا بانی سوائے میرے اور کون ہو سکتا ہے؟
سچے دل سے مجھے معاف نہ کروگے۔ جیتے جی مجھے چین نصیب نہ ہو سکے گا۔
بہن سلطانہ میں یہ خیال کر کے کانپ اٹھتا ہوں کہ میں نے تمھیں برباد
کرنے میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی۔

بہرحال اب میں نے توبہ کر لی ہے اور خدا گواہ ہے کہ میں نے یہ سچے دل سے
کی ہے — اب تم میری بہن ہو — میری بہن کیا تم مجھے معاف کر دوگی۔ اگرچہ
میں اس قابل تو نہیں رہوں۔

تمھارا گنہگار بھائی

دلاور

خط پڑھنے کے بعد سلطانہ نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ دلاور میں نے
تجھے معاف کیا۔ خدا بھی تجھے معاف کر دے۔ وہ زمین کو گھور رہی تھی "لیکن
یوسف کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی"

باب ۶۳

"بڑی بی رو پڑیں"

سلطانہ کو دلاور کا خط پڑھے آج کئی سال گزر چکے تھے . . . . . . اب اختر
شہر کا مشہور بیرسٹر اور افریقہ میں ہندوستانیوں کا سب سے بڑا لیڈر تھا سلطانہ ا

اختر کی شادی تو کبھی ہو جاتی لیکن اختر کا قول تھا "پہلے کماؤ پھر شادی کرو"
اسنے اپنے دل پر جبر کرکے اپنے اس قول پر سختی سے عمل کیا۔ یوں تو وہ جانتا تھا کہ
سلطانہ ایک کروڑپتی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسکو کیا کمی لیکن تھوڑے دن بعد وہ
سلطانہ کی آنکھوں میں ذلیل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مانا کہ سلطانہ کو اس سے بے انتہا
محبت تھی۔ مگر پھر بھی وہ انسان ہی تو تھی۔ اسکو ڈر تھا کہ کہیں سلطانہ کی محبت
نفرت سے نہ بدل جائے کیونکہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ اسکو ڈر تھا کہ کہیں سلطانہ یہ نہ
سمجھ بیٹھے کہ اختر نے اپنی جان کی بازی روپیے کی لالچ میں لگائی تھی۔ کیونکہ دنیا میں اس قسم
کے لوگ بھی موجود ہیں۔ غرض جسطرح بھی ہو سکا اختر نے اپنے دل پر جبر کیا۔ اور
شادی کو چند سال کیلئے ملتوی کر دیا۔ لیکن جس بے چینی اور اضطراب سے یہ زمانہ گزرا
کچھ اختر ہی کا دل جانتا ہے۔

بہرحال اب تو وہ دن آ گیا تھا۔ اختر کی بوڑھی ماں آج بے حد خوش تھی اپنے
بیٹے کی کھلی ہوئی باچھیں دیکھکر اس کا دل باغ باغ ہوا جا رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن
اسوقت ایک شخص اسے بری طرح یاد آ رہا تھا۔ وہ ہوتا تو وہ بھی کتنا خوش ہوتا آج
کے دن ۔۔۔ آہ، اختر کا باپ، اس دن کیلئے نہ رہ سکا۔ کاش وہ بھی اختر کی اس
خوشی کو دیکھ سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے کیا خبر کہ آج اختر کی شادی ہو رہی ہے سلطانہ جیسی
چینی کی گڑیا کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کرے سارس کیطرح محبت کرنیوالا یہ ہنس کا جوڑا پھلے
پھولے ۔ ۔ ۔ ۔ شاد رہے۔ آمین۔ بڑی بی اختر کو گلے سے لگا کر رو پڑیں۔

کیا رکھا ہے دنیا میں سوائے آنسوؤں کے ۔۔ رنج میں بھی آدمی روتا ہے اور
خوشی میں بھی۔ (ختم شد)